ابراہیم اشک
گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے
اندازِ بیاں اور

PDF By :

Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/

غالبؔ کے دوسو سالہ یومِ ولادت پر
بطور خراجِ عقیدت پیش کی جارہی ہے۔

قطعہ تاریخ

ہوئے یومِ غالبؔ کے دو سو برس
کہ کُل اردو والے ہیں سوئے ہوئے

۱۹۹۷ء

اشکؔ

-ابراہیم اشک

اندازِ بیاں اور ....

ابراہیم اشک

ندیم پبلیکیشنز

C-3,Flat No;302,Al-Ansar

Millat Nagar, Andheri(w)

Mumbai-400053

کتاب :اندازِ بیاں اور........(تنقید)
مصنف :ابراہیم اشک
اشاعت :اکتوبر ۲۰۰۲ء
تعداد :پانچ سو
مطبع :بھارت پریس، ممبئی
اہتمام :قمر صدیقی
قیمت :۱۰۰ روپے
سرورق :اعجاز احمد صدیقی
کمپیوٹر کمپوزنگ: اردو چینل پبلیکیشنز
7/3121, Gajanand Colony,Govandi,
Mumbai-43 Phone:5557484,5587860
Email:urduchannel@hotmail.com

ناشر : ندیم پبلیکیشنز
C-3,Flat No;302,Al-Ansar
Millat Nagar, Andheri(w)
Mumbai-400053

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی، علی گڑھ اور ممبئی برانچ
(۲) ''بک ایمپوریم'' سبزی باغ پٹنہ۔۴
(۳) ''مکتبہ دین وادب'' امین آباد، لکھنؤ۔

ANDAZ-E-BAYAN AUR......
By IBRAHIM ASH'K
Price.Rs:100/-

اس خدائے برتر کے نام
جس نے مجھے تخلیق کیا
اور غالب جیسے شاعر
کے اشعار کو سمجھنے
اور شعر کہنے کی صلاحیت عطا کی

-ابراہیم اشکؔ

اندازِ بیاں اور......

غالبؔ کے اشعار کی شرح لکھنا گویا ایک نئے تخلیقی عمل سے گزرنا ہے۔ جس کے لیے تنقیدی شعور سے زیادہ تخلیقی قوت درکار ہے۔ ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں کہ اپنے عہد کے کئی بڑے اور کامل نقّاد غالبؔ کے اشعار کی صحیح اور مکمل شرح لکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ یہی ہے کہ ان میں علم اور دانشوری کی کوئی کمی بھلے ہی نہ رہی ہو لیکن تخلیقی عمل کی خداداد صلاحیت میں ضرور کہیں کوئی کمی رہی ہوگی۔

ابراہیم اشکؔ

اک عمر صرف ہوئی اشکؔ تب کہیں جانا
مقامِ میرؔ کیا عظمتِ اسدؔ کیا ہے

غالبؔ اور میرؔ کو پڑھنا اور سمجھنا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں۔ انہیں سمجھنے کے لیے بار بار پڑھنے اور ایک عمر صرف کرنے کے بعد ہی ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ مقامِ میرؔ کیا ہے۔ یہ شاعر کتنا عظیم اور مرتبے والا ہے۔ اردو زبان و ادب میں اگر اسے خدائے سخن کہا جاتا ہے تو کیوں کہا جاتا ہے؟ کیونکہ ہر کسی کو تو خدائے سخن کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اس کے کلام میں کچھ تو ایسی غیر معمولی خوبیاں ہوں گی جن کی بنا پر میرؔ کو خدائے سخن کہا گیا ہے۔

غالبؔ کو بھی اردو کا عظیم شاعر کہا جاتا ہے۔ اب تک جتنی کتابیں غالبؔ کے کلام پر لکھی گئی ہیں اردو کے کسی بھی اہم شاعر پر نہیں لکھی گئی ہیں۔ اس کے باوجود ایسی کئی باتیں ہیں جن پر مزید لکھا جاسکتا ہے۔ اور یہ سلسلہ تب تک ختم نہیں ہوسکے گا جب تک اردو زبان و ادب کی دنیا آباد ہے۔

ہر شاعر غالبؔ اور میرؔ کو اپنے پسندیدہ شعراء میں شمار کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ یہ ایک عام روایت سی بن گئی ہے بھلے ہی پھر وہ شاعر میرؔ اور غالبؔ کے بارے میں کچھ جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ لیکن میں میرؔ و غالبؔ کو جب اپنے پسندیدہ شعراء میں شمار کرتا ہوں تو میرے نزدیک غالبؔ اور میرؔ کی تمام تر خوبیاں روشن ہوتی ہیں۔

میرؔ کے یہاں میں نے عظمت و وسعت بھی دیکھی ہے اور فکر و خیال کی رنگا رنگ بلندی بھی، احساس کی گہرائی کا ایک بے کراں سمندر بھی دیکھا ہے۔ اور انانیت کے جذبے سے پرنور کردار کی جلوہ سامانیوں سے بھی لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔ ان کی سادگی پر بھی لٹ جانے کو جی چاہتا ہے اور ان کی معنی آفرینی کا بھی معتقد ہونا پڑتا ہے۔ میرؔ جتنے سادہ ہیں اتنے ہی پیچیدہ بھی ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
گفتگو پر مجھے عوام سے ہے

غالبؔ فکر و معنی کے شاعر ہیں ان کی شاعری اعجاز سے کم نہیں ایسے ایسے مضامین انھوں نے باندھ دیئے ہیں کہ عقل گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ ان کے اشعار گنجینۂ معنی ہیں۔ ہر ایک

شرح لکھنے والا غالبؔ کے شعر سے کوئی نیا مفہوم تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ پھر بھی تشنگی بر قرار رہتی ہے۔ اب تک سب سے زیادہ دیوانِ غالبؔ کی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ اور یہ شرحیں اپنے عہد کے تمام مشہور عالم اور دانشوروں نے لکھی ہیں۔ ان میں مولانا الطاف حسین حالیؔ، نظم طباطبائی، حسرت موہانی، نیاز فتح پوری، مولانا شوکت میرٹھی، عبد الرحمٰن بجنوری، علامہ بیخود موہانی، علامہ سہا مجددی، حضرت بیخود دہلوی، آغا محمد باقر، پنڈت جوش ملسیانی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، یوسف سلیم چشتی، شہاب الدین مصطفیٰ، نیرؔ مسعود، مولانا غلام رسول مہر، منظور حسین عباسی اور شمس الرحمٰن فاروقی تک سب ہی نے غالبؔ کے اشعار کو اپنے فہم وادراک کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود غالبؔ کے کئی اشعار اب بھی ایسے ہیں جن پر نئے سرے سے غور و فکر کرنے کی ضرورت مجھے محسوس ہوئی ہے۔ اور یہ ضرورت مجھے اس وقت محسوس ہوئی جبکہ میں عہدِ حاضر کے مشہور نقاد اور دانشور شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب تفہیمِ غالبؔ کا بغور مطالعہ کرنے لگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے غالبؔ اور میرؔ کے اشعار کی جو شرح لکھی ہے اس میں ان کی علمیت اور دانشوری کے جوہر نمایاں ہیں۔ لیکن کہیں کہیں یہی علمیت اور دانشوری اس قدر شعر کے اصل مفہوم اور مضامین پر حاوی ہوئی ہے کہ سب کچھ گڑ گوبر ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ زبردستی اپنی بات منوانے کی ضد میں لمبی چوڑی بحث کر رہے ہیں۔ جبکہ اس بحث کا کوئی نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔

{۱}

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا

گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

مولانا حسرت موہانی نے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ گہر دل کی مثال ہے اور شوق مثالِ دریا ہے، دل اگرچہ وسیع ہے لیکن شوق وسیع تر ہے تنگیٔ مقام کی وجہ

سے شوق دل کے اندر سرد پڑ گیا یعنی دریا کا اضطراب گوہر میں سما گیا۔ یہ تشریح صحیح نہیں ہے غالبؔ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں جبکہ حسرتؔ نے کچھ اور ہی مطلب نکال لیا ہے دراصل وہ غالبؔ کی طرزِ ادا سے واقف ہی نہیں لگتے ورنہ شوق کے سرد پڑنے کی بات ہی کیوں کہتے ؟

شمس الرحمٰن فاروقی حسبِ عادت ڈال ڈال پات پات کی سیر زیادہ کرتے ہیں، جڑ کو نہیں پکڑ پاتے اس شعر کی تشریح میں بھی انھوں نے یہی کیا ہے۔ فرماتے ہیں دل اگرچہ وسیع ہے لیکن شوق وسیع تر ہے اس لیے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کی شکایت ہوتی ہے۔ مثال یہ ہے کہ گوہر میں آب ہوتی ہے اور دریا میں پانی (آب) ہوتا ہے۔ لیکن بھلا کہیں ممکن ہے کہ دریا کا اضطراب (یعنی اس کی موج) گوہر میں سما جائے، گوہر میں ہزار آب لیکن وہ دریا کے آب سے کم ہوتی ہے گہر کی آب ٹھہرے ہوئے پانی سے مشابہ ہے۔ پھر غنی کا ایک شعر پیش کر دیا ہے جس کی ضرورت یہاں نہیں تھی۔ آگے فرماتے ہیں گوہر میں یہ وسعت کہاں کہ پورے دریا کے تلاطم کو اپنے اندر محو کر لے ؟ دل میں ہزار وسعت لیکن وہ شوق کی وسعت سے کم ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دریا گوہر میں محو ہو جائے اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ شوق دل میں سما جائے۔

غالبؔ نے صاف طور پر اپنے شعر میں کہا ہے کہ "گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا" یعنی دریا کی جو بیچینی تھی وہ گہر میں سما چکی ہے جبکہ فاروقی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دریا گوہر میں محو ہو جائے۔ وہ اسی بات کو یوں بھی کہہ رہے ہیں کہ گوہر میں یہ وسعت کہاں کہ پورے دریا کے تلاطم کو اپنے اندر محو کر لے ؟ بھلے ہی غالبؔ چلاتے رہیں کہ "گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا" لیکن شمس الرحمٰن فاروقی بھلا کہاں ماننے والے ہیں۔

شعر کی تشریح بالکل صاف ہے کہ شوق کو دل میں تنگیٔ جا کا گلہ ہے یعنی وہ دل کے اندر ہی چھپا نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ دل سے باہر بھی نکلنا چاہتا ہے۔ "دل میں بھی" کے "بھی" کی بڑی اہمیت ہے۔ دوسرے مصرعے میں غالبؔ نے صاف طور پر مثال دے کر کہا ہے کہ میرا شوق گہر کی طرح نہیں ہے جس میں دریا کا اضطراب سما جاتا ہے۔ اور وہ ایک سیپ میں بند پڑا رہتا ہے۔ اسے تو دل کی وسعت میں بھی تنگی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی یہ شوق دل کی

سرحدوں سے نکل کر تمام عالم کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ یہ خالص غالبؔ کے مزاج کا شعر ہے جس میں ان کی آزادانہ روش اور وسعت پسندی موجود ہے۔ رہی بات گھر میں دریا کے اضطراب سمانے کی تو اس کی دلیل شعر میں غالبؔ نے پیش نہیں کی ہے۔

گھر کے بننے کا عمل یہ ہے کہ سواتی نکشتر کی بارش کی جو بوند سیپ میں گرتی ہے اسی سے گہر بنتا ہے۔ جب یہ بارش ہوتی ہے تو دریا میں اضطراب کا سا عالم ہوتا ہے اور جب یہ بارش ہو چکتی ہے تو سمندر کا تلاطم ٹھہر جاتا ہے۔ سمندر میں کئی اور وجوہات سے بھی تلاطم آتے ہیں، لیکن یہاں شاعر کی مراد گہر سے ہے اس لیے دیگر وجوہات کی تلاش اور وضاحت ضروری نہیں ہے۔

{۲}

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

عام طور سے اس شعر کی شرح کچھ اس طرح لکھی گئی ہے

(۱) جب کچھ نہ تھا تو خدا تھا۔ میں نہ ہوتا تو میں بھی الوہیت کا ایک حصہ ہوتا۔

(۲) جب کچھ نہ تھا تب بھی خدا تھا۔ اگر کچھ بھی خلق نہ ہوتا تب بھی خدا کی ہستی موجود رہتی، مرے وجود نے خدائی میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

دونوں ہی شرحیں نامکمل ہیں دوسرے مصرعے کا خلا ان میں موجود نہیں ہے۔ اب فارقی صاحب جو فرماتے ہیں وہ بھی دیکھ لیں کہ انھوں نے کیا گل کھلایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ شعر زندگی کی مجبوریوں کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی انسان وجود میں آنے اور زندہ رہ کر اپنی تباہی کرنے پر مجبور ہے۔ اس کے ہونے نہ ہونے سے کائنات کے نظام میں کوئی فرق نہ پڑا ہو لیکن اس کو وجود میں آنا اور زندگی اور موت کو برداشت کرنا ہی ہے۔ آگے فرماتے ہیں خدا تو ہر صورت میں موجود رہتا، وجود میں آنے سے مجھ پر ستم ٹوٹے ہیں اگر خدانہ خواستہ میں کچھ بھی نہ ہوتا تو خدا جانے میری ناقدری کا کیا عالم ہوتا۔ پھر ایک نکتہ یہ بھی بیان کرتے ہیں اگر میں وجود میں نہ لایا گیا ہوتا تو کیا ہرج تھا؟

فاروقی صاحب نے دوسرے مصرعے کو کچھ یوں لکھا ہے "ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا گر تو کیا ہوتا" غالبؔ کے مصرعے کی یہ اصلاح خوب ہے۔ اصل مصرع ہے "ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا" علاوہ فاروقی صاحب کی تحریر کے ہر جگہ یہ مصرع اسی طرح درج ہے۔ فاروقیؔ صاحب نے جو نکتے بیان کیے ہیں ان میں کئی جگہ وہ شعر کے اصل مضمون سے وہ دور نکل گئے ہیں۔ یہ تفریح ان کی فطرت میں شامل ہے۔ شعر میں کہیں نہیں ہے کہ انسان زندہ رہ کر اپنی تباہی کرنے پر مجبور ہے۔ ویسے بھی مجبوریاں غالبؔ کے اشعار میں کم ہی ملتی ہیں وہ تو عزم و ہمت کا درس دینے والا شاعر ہے۔ پھر شعر میں یہ خیال بھی کہیں موجود نہیں ہے کہ میں کچھ بھی نہ ہوتا تو خدا جانے میری ناقدری کا کیا عالم ہوتا اور غالبؔ یہ بھی نہیں کہہ رہا ہے کہ میں وجود میں نہ لایا گیا ہوتا تو کیا ہرج تھا؟

شعر کا اصل مفہوم بالکل صاف ہے کہ جب کچھ نہ تھا تو خدا موجود تھا کچھ نہ ہوتا تب بھی خدا موجود ہوتا مجھے تو میرے ہونے نے ڈبو دیا اگر میں نہ ہوتا تو کیا ہوتا.......؟ ظاہر ہے خدا ہوتا۔ انسان کی عظمت کا سراغ لگانے والا یہ خیال شمس الرحمٰن فاروقی اور دیگر شراح کی سمجھ میں نہیں آیا۔ غالبؔ کا یہ خیال بالکل اچھوتا اور عظیم ہے۔ جہاں اس کا وجود میں نہ آنا بھی خدا کے وجود کے برابر ہے۔ بے مثال اور بے پناہ شعر ہے جس کی تخلیق غالب جیسا شاعر ہی کر سکتا ہے۔

{۳}

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

اس شعر کی شرح میں ایک بار پھر شمس الرحمٰن فاروقی نے دھاندلی کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ دل موت کے لمحے تک موت سے گریزاں رہا یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو زندگی جینے کی دعا دی جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دمِ مرگ آیا تو ہی قضا آئی موت سے پہلے تو موت نہیں تھی جس لمحہ مژہ یار کا سامنا ہوا موت آگئی یا جس وقت موت آئی تھی اس وقت مژہ یار کا

سامنا ہو ہی گیا۔ سامنا ہی اس وقت ہوتا تھا جب موت آتی تھی۔ لہٰذا گریزاں رہنا نہ رہنا برابر تھا۔ الفاظ کی بھول بھلیاں میں قارئین کو الجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور صحیح مفہوم بیان نہیں کرپائے ہیں۔ شعر میں مژہ یار سے تادمِ مرگ گریزاں رہنے کی بات غالبؔ نے کہی ہے۔ جبکہ فاروقی صاحب موت سے گریزاں رہنے اور مژہ یار کے سامنا ہونے کی بات کر رہے ہیں یہ سب غالبؔ کے الفاظ کے دروبست کے نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ ورنہ شعر بالکل صاف ہے۔

میرا دل موت کے آخری لمحے تک مژۂ یار سے گریزاں رہا یہی وجہ تھی کہ میں موت کی تکلیف کو بھی بہت آسان سمجھا یعنی مژۂ یار کے زخم کی تکلیف موت کے درد سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس شعر میں مژۂ یار اور پیکانِ قضا میں جو ربط معنوی پیدا کیا گیا ہے وہی شعر کا اصل حُسن ہے مژۂ یار سے گریزاں رہنا اور پیکانِ قضا کو آسانی سے جھیل جانا غالبؔ کی طرزِ ادا کا بھرپور ثبوت اس میں موجود ہے۔

{۴}

شب کہ وہ مجلس فروز، خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

اس شعر میں تمام شارحین شمع کی روشنی کے آس پاس بھٹکتے رہ گئے ہیں جبکہ مرکزِ خیال مجلس فروز خلوتِ ناموس میں بیٹھا ہوا ہے جس کا ہر شمع سے رشتہ اب تک موجود ہے۔ شعر کی تشریح ہم بعد میں کریں گے پہلے تمام شراح کیا کہتے ہیں ذرا ان کی بات پر بھی غور کرلیں۔

حسرت موہانی بیان کرتے ہیں شب کو عصمت و عفت کی محفل خلوت میں محبوب جلوہ افروز تھا۔ اس وقت شمع کی یہ حالت تھی کہ اس کا ہر رشتہ اس کے حق میں خارِ پیراہن ہوگیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوب کی خلوتِ ناموس میں جہاں کسی کا گزر نہیں شمع کی بھی بے قراری سے عجیب حالت ہوگئی تھی۔ شعر میں شمع کی عجیب حالت ہو جانے والی بات کہیں نہیں ہے۔ پھر

عصمت و عفت کی محفلِ خلوت سے پتہ نہیں مولانا کی کیا مراد ہے؟ ظاہر ہے یہ شرح نا مکمل اور اصل مضمون کو بیان کرنے میں ناکام رہی ہے۔ آغا باقر لکھتے ہیں کہ شمع کو احساس اجنبیت اس قدر شدید تھا کہ وہ بے چین ہو رہی تھی۔ یہاں بھی بات نہیں بنتی دراصل یہ شعر شمع کا ہے ہی نہیں مجلس فروز کا ہے جس کے آتے ہی محفل میں ہر ایک شمع روشن ہو جاتی ہے۔

بیخود دہلوی نے غالبؔ کے کئی اشعار کی بھر پور شرح لکھی ہے لیکن اس شعر کی تہہ تک وہ بھی نہیں پہنچ پائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ معشوق چونکہ محفل خلوت میں بزم افروز تھا اس لیے شمع اس کے سامنے خجالت سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ ذرا اس بات پر غور کیا جائے کہ اگر معشوق بزم افروز تھا اور شمع اس کے سامنے خجالت سے پانی پانی ہو رہی تھی تو خلوت کے کیا معنی ہوئے؟ خلوت تو رہی ہی نہیں۔ جبکہ غالب نے صاف کہا ہے کہ مجلس فروز خلوتِ ناموس تھا۔ ظاہر ہے اس شرح میں بھی بات نہیں بنتی۔

بیخود موہانی تو اور بھی دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں اور ان کے یہاں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو بھی نئی بات نظر آ رہی ہے۔ یہ شرح اس طرح ہے کہ فانوس کو معشوق سے ہم آغوشی کی آرزو تھی اس لیے شمع اس کے بدن میں خار بن کر کھٹک رہی تھی فانوس چاہتا تھا کہ شمع میرے کنارے سے نکلے اور میں معشوق کو اپنی آغوش میں بھر لوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آغوش میں بھرنے کے لیے یہ شارحین اس قدر بیتاب کیوں رہتے ہیں کیا غالبؔ ہر شعر میں آغوش میں بھرنے کی ہی بات کرتے رہے ہیں؟ پھر شعر میں کہیں بھی آغوش کا لفظ نہیں ہے۔ اسے تو ہم بیخود موہانی کے دماغ کا خلل ہی کہہ سکتے ہیں۔ غالبؔ کے شعر کی شرح نہیں کہہ سکتے۔ پتہ نہیں فاروقی کو اس میں کیا نئی بات نظر آ گئی۔ اب آیئے ذرا دیکھیں فاروقی صاحب نے کیا نیا نکتہ نکالا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی شعر کی شرح یوں بیان کرتے ہیں۔ "شمع کی بے چینی کی اصل وجہ مصرع اولیٰ کے فقرے "مجلس فروز" میں مضمر ہے۔ جبکہ شمع کی بے چینی کا کوئی اشارہ شعر میں نہیں ہے کہ رشتۂ ہر شمع کہا گیا ہے چلئے آگے بڑھتے ہیں۔ مزید فرماتے ہیں۔

(ا) معشوق مجلس فروز تھا۔ مجلس فروزی شمع کی بھی صفت ہے شمع اپنی چمک دمک کو ماند اور اپنی مجلس فروزی کو کمتر دیکھ کر رشک سے جل رہی تھی۔ لہذا بے چین تھی۔ غور و

فکر کی بات یہ ہے کہ مجلس فروز خلوت ناموس میں تھا وہ آج مجلس فروز تھا پھر شمع کے رشک کرنے، جلنے اور بے چین ہونے کی بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔

(۲) لباس اس کے بدن پر یوں چبھ رہا تھا جیسے کانٹے چبھتے ہیں۔ وہ اسے اتار پھینکنا چاہتی ہے کہ محبوب کے سامنے خود کو بے لباس اور عریاں کردے اور محبوب بے پردہ اور شمع بے فانوس کا دوبدو مقابلہ ہو سکے۔ کاش اس خیال کو مد نظر رکھتے ہوئے غالبؔ کوئی شعر کہتے تو عریانیت پر سب سے گھٹیا شعر اسے ہی کہا جاتا۔ ذرا غور کیجئے محبوب کا اور شمع کا عریاں ہونا اور پھر عریانیت کے حسن کا مقابلہ یہ شمس الرحمٰن فاروقی جیسا عالم اور دانشور ہی سوچ سکتا ہے۔ ابھی ان کی بات پوری نہیں ہوئی ہے، آگے بڑھتے ہیں۔

(۳) جلوۂ محبوب اور شمع کے درمیان فانوس تھا۔ فانوس کا اس طرح حائل ہونا اسے ناگوار تھا وہ بے چین تھی کہ اسے اتار پھینکے تاکہ جلوۂ محبوب کی زیارت بے محابا کر سکے۔ اس شرح کی روشنی میں شعر کا ہر مقدمہ دلیل سے مستحکم نظر آتا ہے اور اس کے سارے پیکر باہم دست و گریباں ثابت ہوتے ہیں۔ صرف لفظ "ناموس" بھرپور کام نہیں کر رہا لیکن اس کے لیے نوجوان شاعر شاید قابلِ معافی ہے۔

یہاں تین باتوں پر ہنسی آتی ہے ایک تو شمع کا لباس اتار پھینکنا، دوسری بات فاروقی کا اپنی پیٹھ خود ہی تھپتھپانا ظاہر ہے کہ ایسی شرح لکھنے پر کوئی اور تو ان کی پیٹھ تھپتھپانے سے رہا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ "ناموس" لفظ ان کی سمجھ میں نہ آنے پر انھوں نے نوجوان شاعر غالبؔ کو کسی بزرگ کی طرح معاف کر دیا۔ بہت خوب کہنا ہی پڑتا ہے کہ شرح نگار ہو تو فاروقی جیسا کہ شاعر کا مضمون اور خیال سمجھ میں نہ آئے تو اسے معاف بھی کرتا چلے۔

اب ذرا اس شعر کی تشریح پر غور کرتے ہیں کہ غالبؔ نے یہ شعر عریانیت کا ریکارڈ توڑنے کے لیے کہا یا کسی اور ہی مقصد سے کہا ہے۔ غالبؔ کا خیال ہے کہ رات وہ مجلسوں کو فروزاں کرنے والا، مجلسیں آباد کرنے والا خلوتِ ناموس ہو گیا تھا، تنہائی کی آبرو بن گیا تھا۔ یا یوں کہئے کہ گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا تھا۔ لیکن ہر ایک شمع سے اس کا رشتہ اب بھی برقرار تھا اسی طرح جس طرح

خارِ کسوت سے فانوس کا رشتہ ہوتا ہے۔ یعنی محفل میں روشن ہونے والی ہر شمع کی یاد اس کے ذہن ودل میں تازہ تھی اور جس طرح فانوس کے لباس میں روشنی خار بن کر چبھتی ہے اسی طرح ہر ایک شمع کی روشنی خار کی طرح اس کے دل میں چبھ رہی تھی یعنی خلوت میں رہنے کے باوجود وہ مجلس فروز محبوب خلوت میں نہیں تھا۔ بلکہ وہاں بھی اس کے تصور میں ایک مجلس آباد تھی۔ بہت ہی خوبیوں والا شعر ہے، مضمون بندی کی اس سے اچھی مثال کوئی اور کیا ہوگی ؟

شعر کہنے کا ہنر اشکؔ انھیں آتا ہے
حرفِ بے رنگ میں معنی جو نہاں کرتے ہیں

لیکن حرفِ بے رنگ میں نہاں معنی کو سمجھ لینا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ غالبؔ کو سمجھنے غالبؔ بننا پڑتا ہے، اس کے مزاج میں ڈوبنا پڑتا ہے۔

{۵}

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود
ہنوز تیرے تصوّر میں ہے نشیب و فراز

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ اس شعر کی شرح لکھنے میں ہر شارح نے دھاندلی کی ہے۔ کئی نے وجود کو وحدت الوجود کہہ کر شعر کے معنی و مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کی ہے ان سب کا ذکر کرنا بے معنی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر کی جو شرح لکھی ہے وہ کچھ اس طرح ہے ملاحظہ ہو۔

شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ تو اپنے وجود کے بارے میں وہم کی منزل پر ابھی تک نہیں پہنچا ہے۔ ابھی تو تُو راستے کے خوف و خطر میں گرفتار ہے، ابھی تو مبتدی ہے، منتہی کا درجہ پانے کی سعی نہ کر۔ داد دینی پڑتی ہے فاروقی صاحب کو کہ وہ ایسے اچھوتے اور نایاب مضامین اور مفاہیم کہاں سے کھوج نکالتے ہیں۔ حالانکہ شعر غالبؔ نے کہا ہے لیکن اس بیچارے کے ذہن میں بھی یہ سب کچھ نہیں رہا ہوگا جو فاروقی نے اپنی علمیت اور دانشوری سے بیان کر دیا

ہے۔خیر......اب آئے ذرا اس شعر کی شرح بیان کر دی جائے۔

مضمون بالکل صاف ہے۔اس کے لیے جو غالبؔ کو غالبؔ کی طرح پڑھ کر سمجھ سکتا ہو۔ورنہ مشکلات ہی مشکلات ہیں۔اچھے اچھے عالم اور دانشور اندھے کی طرح ٹٹول ٹٹول کر فیلِ روسیاہ کی تعریف کرنے کے عمل سے گزرتے اور موضوعِ مذاق بنتے ہیں۔

زیرِ بحث شعر کی شرح ملاحظہ ہو۔غالبؔ آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے انسان تو وہم وجود کے بے ہودہ یا نامعقول بیابان میں نہ بھٹک کیونکہ ابھی تیرے تصوّر میں پستی اور بلندی کی کئی منزلیں ہیں جن سے تجھے گزرنا ہے۔اگر تو اپنے وجود پر شک کرنے لگا تو ان منزلوں سے گزرنا تیرے لیے مشکل ہو جائے گا۔تیرا عزم و ہمت ٹوٹ جائے گا۔ انسان کو حوصلہ بخشنے والا یہ شعر خالص غالبؔ کے مزاج کا ہے۔افسوس صد افسوس کہ شمس الرحمٰن فاروقی غالبؔ کے اس مزاج کو سمجھنے سے قاصر رہے اور راستے کے خوف و خطر میں گرفتار ہونے کی بات کرنے لگے۔غالبؔ تو خوف و خطر کا مذاق اڑانے والا زندہ دل شاعر ہے جو موت کے در پر کھڑا ہو کر بھی اس قدر زندہ دلی کی بات کرتا ہے۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اب وحدت الوجود پر زرا سی بحث کر لی جائے۔اگر غالبؔ کی مراد وحدت الوجود سے ہوتی ایسی کون سی مشکل آڑے آ رہی تھی کہ انھوں نے وحدت الوجود نہ کہا۔پھر وہم وجود سے مراد اگر وحدت الوجود نکالے جائیں تو 'نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد ہے' بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وحدت الوجود سے یہ تو کہا نہیں جا سکتا کہ تو اس بے ہودہ وہم کے بیاباں میں نہ بھٹک۔ کیونکہ وحدت الوجود تو وہم و گمان کی ہر منزل سے بالاتر ہے۔شرح لکھتے وقت اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہئے کہ جو لفظ شاعر نے رکھا ہے اسی کی بنا پر معنی کیے جائیں۔اپنی مرضی سے کچھ تو بھی اضافہ کرنا اندھیرے میں تیر چلانا ہے جس کا نشانہ کبھی صحیح لگ ہی نہیں سکتا۔

{۶}

وسعتِ سعیٔ کرم دیکھ کہ سر تا سر خاک
گزرے ہے آبلہ پا، ابرِ گہر بار ہنوز

اس شعر میں کئی بھول بھلیاں ہیں۔ جن میں الجھ کر شرح نگار ایسا بھٹکتا ہے کہ اس کی واپسی بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ زیادہ تر "آبلہ پا ابرِ گہر بار" میں الجھے ہیں۔ دوسرے "سر تا سر خاک" سے ہر کوئی بیگانہ دیکھائی دیتا ہے۔ پھر ہنوز جس کی شعر میں بڑی اہمیت ہے شرح لکھنے والوں نے اسے عام ردیف سمجھ کر چھوا تک نہیں ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کس نے کیا کہا ہے۔

عام طور پر اس شعر کا مطلب بقول فاروقی کچھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ابرِ گہر بار زمین کو سیراب کرنے لئے طویل سفر کرتا ہے اور آبلہ پا ہو جاتا ہے لیکن اس کی سعی کرم کی وسعت دیکھ کہ وہ پھر بھی زمین کو سیراب کرنے سے نہیں رکتا۔ یعنی کریم باوجود تکلیف اٹھانے کے سخاوت سے دست کش نہیں۔ شراح نے مضمون تو صحیح بیان کیا ہے۔ یہ شمس الرحمٰن فاروقی کے حساب سے بھلے ہی صحیح ہو ہمارے حساب سے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ابر کے طویل سفر کرنے اور اس کے آبلہ پا ہونے کی بات غالبؔ نے شعر میں نہیں کہی ہے۔ آبلہ پا اور ابرِ گہر بار غالبؔ نے ایک ساتھ استعمال ضرور کیا ہے لیکن یہ دونوں ایک ساتھ نہ ہو کر الگ الگ ہیں۔ ابر کے پاؤں میں آبلے پڑنے والا مضمون اس میں قطعی نہیں ہے۔ اس پر بحث آگے کی جائے گی پہلے یہ دیکھ لیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر کی شرح میں کیا نیا گل کھلانے کی کوشش کی ہے۔

باوجود آبلہ پائی ابر اس قدر کریم ہے کہ گہر بار گزرتا ہے۔ یعنی ابر سے برسنے والے بارش کے قطرے نے مثل گہر ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ استعارہ بھی بالکل صحیح ہے۔ دور دور تک سفر کرنے کے باعث ابر کے پاؤں میں چھالے پڑ جاتے ہیں لیکن پھر بھی وہ گہر باری بند نہیں کرتا۔ آگے کئی بے سر پیر کی باتیں ہیں اس کے بعد کہتے ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابر کو آبلہ پا کیوں کہا؟ اس کی کئی وجہیں ممکن ہیں۔ بارش سے بوجھل بادل زمین کی

طرف جھکے ہوئے اور مدور شکل کے نظر آتے ہیں ظاہر ہے کہ بادل کا جو حصہ ہمیں نظر آتا ہے وہ اس کا نچلہ حصہ ہے لہٰذا وہ آبلوں بھرے پاؤں سے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

مرحبا، آفریں، سبحان اللہ، بہت خوب غالبؔ اگر زندہ ہوتے تو اپنا سر ضرور پیٹ لیتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ دنوں کے لئے وہ شعر کہنا بھی ترک کردیتے کہ ان کے شعر کے معنی عالم اور دانشور کس طرح نکالتے ہیں۔ ابر کا دور دور تک سفر کرنا اور پھر اس کے پاؤں میں چھالے پڑنا پھر بادل کا نچلہ حصہ دیکھ کر اسے پاؤں سے مشابہ سمجھنا یہ سب گڑبڑ غالبؔ کے الفاظ کی صحیح نشست کو نہ سمجھ پانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ دیکھا جائے تو شعر چار ٹکڑوں میں بنتا ہوا ہے۔

(۱) وسعت سعئی کرم دیکھ۔ (۲) کہ سر تا سر خاک۔ (۳) گزرے ہے آبلہ پا۔ (۴) ابرِ گہربار، ہنوز۔ اب شعر کی شرح یوں ہوگی اپنے محبوب کی سعی کرم کی وسعت دیکھ کر آبلہ پا اس قدر خوش ہوتا ہے کہ لاکھ مجروح ہونے کے باوجود اب بھی جگہ جگہ خاک پر ابر کی طرح موتی برساتا دیوانہ وار گزرتا ہے گویا اس کے پاؤں کے آبلے پھوٹ پھوٹ کر موتیوں کی طرح خاک کے سرے سرے پر بکھر رہے ہیں۔ دیوانگی اور بیخودی کا یہ عالم غالبؔ کے مزاج کی خاصیت ہے۔ میرؔ اور مومنؔ کے یہاں بھی یہ بیخودی کثرت سے ملتی ہے۔

{۷}

یک قلم کاغذ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تب گرمیٔ رفتار ہنوز

دیکھا جائے تو مضمون بالکل صاف ہے لیکن اس شعر کی شرح میں بھی شمس الرحمٰن فاروقی دھاندلی کرنے سے باز نہیں آئے ان کی علمیت یہاں بھی Over doze ہوگئی ہے۔ فرماتے ہیں عام طور پر اسے عاشق کی گرم رفتاری کی تصویر کہا جاتا ہے لیکن یہ مضمون معشوق کی گرم رفتاری کا بھی ہوسکتا ہے (بس یہیں سے بہکنا شروع ہوگیا ہے) خاص کر ایسا معشوق جو اپنے عاشق کو تلاش کرنے نکلا ہو۔ یا جو عاشق سے دور ہوکر

جارہا ہو۔ نکتہ اس امر میں یہ ہے کہ عام طور پر کہا گیا ہے کہ نقش پا میں گرمیٔ رفتار کا اثر اس قدر باقی ہے کہ سارا دشت پڑا جل رہا ہے۔ لیکن اگر ایسا ہے تو "کاغذ آتش زدہ" کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی (یہاں بھی بھٹک گئے اور زبردست طریقے سے بھٹک گئے ہیں) معنی دراصل یہ ہیں کہ سارا دشت نہیں جل رہا ہے بلکہ صرف وہ جگہ جل گئی ہے جہاں قدم پڑا ہے اس طرح دشت جلتے ہوئے کاغذ کا نقشہ پیش کررہا ہے۔ کاغذ جب جلتا ہے تو سارا ایک وقت نہیں جلتا بلکہ جگہ جگہ اس پر روشن نقطے نمودار ہو جاتے ہیں۔

ایسا لگتا ہے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے کبھی کاغذ سے اپنا سگار جلا کر نہیں دیکھا اس بہانے ایک ورق جلا کر دیکھ لیں تو پتہ چل جائے گا کہ کاغذ ایک کونے سے دوسرے کونے تک پورا جل جاتا ہے۔ لیکن شعر میں کاغذ کے جلنے کی بات کہیں نہیں ہے۔ فاروقی اس شعر کے معنی تلاش کرنے میں شروع سے آخر تک بھٹکتے رہے ہیں۔ لیکن ان کے پلّے کچھ بھی نہیں پڑا ہے۔ یہ مضمون عاشق و معشوق کا سرے سے ہے ہی نہیں۔ پھر غالبؔ نے کاغذ آتش زدہ نہیں کہا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت۔ اور ایک خاص بات یہ کہ ہنوز کی ردیف اس شعر میں ایسا مزہ دے رہی ہے کہ صدیوں کا احاطہ کررہی ہے شعر کی شرح ملاحظہ ہو۔

ایک قلم اور کاغذ کی طرح یہ دنیا اور انسان کی زندگی ہے۔ دنیا ایک جلتے ہوئے صفحۂ دشت کی مانند ہے جس پر آدم سے لے کر آج تک (ہنوز) اپنی گرمیٔ رفتار سے نقش بناتا ہوا انسان گزر رہا ہے۔ یعنی جس طرح کاغذ پر قلم چلتا اور نقش بناتا ہے اسی طرح انسان بھی چلتے ہوئے صفحۂ دشت پر اپنی گرمیٔ رفتار سے نقش بناتا ہے۔ گرمیٔ رفتار زندگی کے رواں دواں ہونے کی علامت ہے اور آتش زدہ صفحۂ دشت دنیا کے دکھوں اور تکلیفوں کی علامت ہے۔ شعر کیا ہے گنجینۂ معنی کے طلسم کا بھرپور ثبوت ہے۔ ایسے ہی شعر غالبؔ کو اردو زبان و ادب کا عظیم شاعر کہنے کے لیے اہلِ نظر اور اہلِ ہنر کو مجبور کردیتے ہیں۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا؟

{۸}

تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

شمس الرحمٰن فاروقی اس شعر کی بحر اور لفظیات پر بحث کرنے میں شاید یہ بھول گئے کہ شعر کی شرح بھی لکھنا ہے۔ حالانکہ ایسے اشارے ضرور دے دیے ہیں کہ شعر کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہو اس لحاظ سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ایک جملہ یہاں کہا اور ایک وہاں اچھال دیا۔ اور غیر ضروری بحث کرتے رہے۔ ایک دو انگریزی حوالے بھی اس درمیان انھوں نے دے دیے ہیں۔ ویسے زیرِ بحث شعر اتنا الجھا ہوا بھی نہیں ہے کہ اس پر خواہ مخواہ لمبی چوڑی بحث کی جائے۔ مضمون بالکل صاف ہے اور معنی بالکل واضح۔

شعر کی شرح ملاحظہ ہو۔ اے آئینہ دیکھنے والے تو اسی میں کیوں کھو کر رہ گیا ہے کوئی تماشا کر تیرا کام تو انداز و ادا دکھانا ہے اور ہم بڑی تمنا لے کر تیری جلوہ سامانیاں دیکھنے کے لیے کب سے بیتاب ہیں۔

اگر آئینہ داری سے مراد آئینہ دکھانا لی جائے تو شعر کے مفہوم میں ذرا سی تبدیلی ہو جائے گی۔ تب شعر کی شرح کچھ اس طرح ہو گی اے میرے محبوب ہم تو بڑی تمنا لے کر تیرے انداز و ادا کا تماشا دیکھنے آئے تھے لیکن تو تو ہمیں ہی آئینہ دکھانے میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ ہماری گذارش ہے کہ تو ہمیں آئینہ دکھانا چھوڑ اور اپنے انداز و ادا کا تماشا دکھا تاکہ ہماری تمنا پوری ہو سکے۔

{۹}

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

اس شعر کی شرح کرنا زیادہ مشکل نہیں کیونکہ مضمون اور معنی بالکل صاف ہیں۔
شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کی دو شرحیں بالکل درست لکھی ہیں۔ تیسری شرح میں پھر ان

کی علمیت کا دخل آ گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ عاشق پر جذباتی ہیجان کے باعث لرزہ واضطراب طاری ہے اور معشوق سمجھتا ہے کہ یہ لرزش خوف کے باعث ہے اسی لیے لفظ "وصل" خاص اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ عاشق چیں بر جبیں ہو کر کہتا ہے کہ وصل کا ہنگام اور مجھے لرزش اس وجہ سے ہو کہ میں خوفزدہ ہوں ؟ واہ تم کو بھی وہم نے کس پیچ و تاب میں ڈال دیا۔

اس شرح میں ایک تو خوفِ رقیب کو فاروقی صاحب بھول گئے۔ دوسرے جذباتی ہیجان یا لرزش جیسے الفاظ موزوں نہیں ہیں ورنہ غالبؔ کو یہ کہنے میں کیا مشکل تھی۔

(۱) لرزش ہے مجھ کو وصل میں خوفِ رقیب سے

(۲) ہیجان سا ہے وصل میں خوفِ رقیب سے

جو بات اضطراب میں ہے وہ کسی اور لفظ میں نہیں ہے۔ شرح یہی ہے کہ کیا تم خوفِ رقیب سے وصل میں مجھے مضطرب سمجھ رہے ہو ؟ اگر ایسی بات ہے تو یہ جان لو کہ تم وہم میں ہو۔ تمہیں دھوکہ ہوا ہے اور اس وہم کی وجہ سے تم خواہ مخواہ پیچ و تاب کے شکار ہو رہے ہو۔ یعنی میں بالکل تروتازہ ہوں اور تم بھی یہ پیچ و تاب چھوڑ کر وصل کے اصل مزے اٹھاؤ۔

{۱۰}

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مولانا الطاف حسین حالیؔ نے اس شعر کی شرح یوں بیان کی۔ عمر کو ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینا حسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دیتا ہے۔ میری حالت تو یہ ہے کہ ہاتھ میں باگ ہے اور نہ پاؤں رکاب میں ہے بالکل بے اختیار اس پر سوار ہوں دیکھئے وہ کہاں جا کر تھمتا ہے یا کتنی دور جا کر مجھے اپنی پشت پر سے گرا دیتا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی حسبِ عادت اس بار بھی کئی صحراؤں اور سمندروں کا سفر کرنے کے بعد کوئی پانچ شرح لکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ہر ایک شرح میں کئی ایسی باتیں

موجود ہیں جو زیرِ بحث شعر سے قطعی تعلق نہیں رکھتی مثلاً۔

(۱) کبھی وہ وقت بھی تھا جب میں اپنے ماحول میں پوری طرح پر اعتماد اور اپنی دنیا کا مالک تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسان نئی تہذیب کے پیچیدہ مسائل یا نئی زندگی کے گوناگوں مصائب کا شکار تھا۔ ایک طرح سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک وقت وہ تھا جب انسان پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا۔

(۲) رخشِ عمر کبھی ساکت بھی رہا ہوگا ورنہ میں اس پر سوار کس طرح ہو سکتا؟ (بہت خوب)

(۳) رخشِ عمر کا سفر دراصل زمانی سفر ہے۔ کیا زمان و مکان دونوں ایک ہیں ؟ (جواب خود ہی تلاش کریں)

(۴) دوسرے مصرعے میں زمان و مکان کی وحدت کا ایک اور اشارہ ملتا ہے۔ (آخر تلاش کر ہی لیا)

(۵) مجھے خیال تھا کہ میں جو ہوشیار شہسوار ہوں اس اڑیل گھوڑے (یعنی زمان و مکان، یعنی وجود) کو اپنی چال چلاؤں گا۔ لیکن گھوڑا میرے قابو میں نہ رہا۔ رخشِ عمر کی رفتار کا بے قابو ہونا گویا زمان و مکان اور ماحول پر میری حکومت کا ختم ہونا ہے۔

فاروقی صاحب کی علمیت اور دانشوری کی جتنی داد دی جائے کم ہے فی الحال ہم ذرا اپنا چھوٹا سا کام بھی کرلیں یعنی غالبؔ کے زیرِ بحث شعر کی شرح بیان کردیں۔ ملاحظہ ہو۔

رخشِ عمر یعنی عمر کا گھوڑا اپنی چال سے چلا جا رہا ہے۔ خدا جانے اب یہ کہاں جا کر تھمے گا۔ میرا عالم یہ ہے کہ میں اس سے بالکل بے نیاز ہوں۔ اس قدر کہ نہ تو میں نے اس کی باگ ہی سنبھال رکھی ہے نہ اپنے پاؤں رکاب میں ڈالے ہیں۔ میں نے اسے بالکل کھلا چھوڑ دیا ہے یعنی میں نے اپنی زندگی کو اب بغیر کسی پابندی اور رکاوٹ کے جینا سیکھ لیا ہے۔ موت کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے رخشِ عمر کہاں تھمے گا اس کی فکر میں نے بالکل چھوڑ دی ہے۔

عمر کو رخشِ عمر کہہ کر غالبؔ نے وقت کے ساتھ بھاگتی دوڑتی زندگی کی جو تصویر کشی شعر میں پیش کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شعر میں فکر کی بلندی بھی اور معنی آفرینی بھی. اور سب سے بڑی بات تو یہ کہ غالبؔ کے مزاج کی بیخودی اس شعر میں بھر پور ہے۔

"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

{11}

ہے مشتمل نمود صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اس شعر کی شرح لکھنے والوں کو وجود کے لفظ نے خاصا الجھن میں ڈالا ہے اور وہ اس الجھن میں وحدت الوجود تک جا پہنچے ہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ نظم طباطبائی، بے خود موہانی، بے خود دہلوی اور حالؔی سب کے سب وجود لفظ کے ملتے ہی وحدت الوجود کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس شعر کے سلسلہ میں بھی آسی اور نظم طباطبائی، حالؔی کے ہم نوا ہو کر شعر کی شرح کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ یہ شعر وحدت الوجود اور کثرتِ موہوم کی تمثیل ہے۔ قطرہ اور موج اور حباب کی ہستی کچھ نہیں ہے بلکہ یہ سب صورتیں دریا کی بدولت نظر آ رہی ہیں۔ ہستیٔ موجودات دراصل وجود واجب کے ضمن میں ہے۔

بے خود موہانی فرماتے ہیں کہ مختلف صورتوں کے مجموعے کا نام سمندر ہے تو قطرہ، موج، حباب کو الگ الگ کیوں سمجھا جاتا ہے؟

شوکت میرٹھی کا بیان ہے کہ فی حدِ ذات دریا کا مستقل وجود نہیں ہے، صرف صورتیں ہی صورتیں ہیں اگر ہم اس مجموعے سے ایک ایک شئے کو سلب کرتے جائیں تو اخیر میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔

شمس الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں یہ شعر نہ وحدت الوجود کا ہے اور نہ وحدت الشہود کا۔ سمندر یعنی کائنات کچھ نہیں ہے یہ محض صورتیں ہی ہیں جن کو دیکھ کر ہم دھوکے میں آجاتے ہیں۔ تم لوگ قطرہ و موج و حباب کو سمندر سمجھتے ہو حالانکہ قطرہ و موج و حباب کا وجود تمہارے ذہن کا تابع ہے۔ یہ محض صورتیں ہیں ان کا وجود صرف ہمارے ذہن میں ہے۔ نہ قطرہ کچھ ہے نہ موج نہ حباب۔ یہ محض چند صورتیں ہیں جن کو تمہاری قوت مدرک نے تمہاری آنکھوں پر منعکس کیا ہے۔ کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ ہو تم ہی تم ہو۔ یہ بات بالکل نہیں ہے کہ جو کچھ ہو تم ہی تم ہو اور کہیں کچھ نہیں ہے۔ غالبؔ نے زیرِ بحث شعر میں یہ قطعی نہیں کہا ہے۔ نہ ہی

قوت مدرک سے آنکھوں پر صورتیں منعکس ہونے کا خیال ظاہر کیا گیا ہے۔

جو خیال ظاہر کیا گیا ہے وہ اس طرح ہے کہ سمندر کے وجود کا پتہ ہمیں چند صورتوں کے نمایاں ہونے سے ملتا ہے۔ یہ صورتیں ہیں قطرہ، موج اور حباب جن پر وجود بحر قایم ہے۔ لیکن ان صورتوں میں کیا دھرا ہے یہ تو سب کی سب ناپائدار ہیں۔ قطرہ، موج اور حباب کی زندگی تو پل بھر کی ہے۔ اب اگر یاں کیا دھرا ہے پر غور کریں تو غالبؔ کا اندازِ بیان صاف یہ کہہ رہا ہے کہ اس بحرِ بیکراں کی اوقات ہی کیا ہے؟ کیا دھرا ہے یہاں صرف قطرہ و موج و حباب؟ یعنی لوگ خواہ مخواہ اس کی عظمت و وسعت کے گن گاتے ہیں۔ جبکہ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس شعر میں جو تیور غالبؔ نے چھپا رکھا ہے جب تک اسے نہ سمجھ لیا جائے تب تک صحیح مفہوم تک پہنچ پانا بہت ہی مشکل ہے۔ یہاں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ غالبؔ کے شعر پڑھنے اور سمجھنے کے لیے قارئین کو اپنے اندر اس کے تیور بھی پیدا کرنا پڑتے ہیں۔

{۱۲}

ہے غیب، غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب سے

اس شعر کے تعلق سے شمس الرحمٰن فاروقی فرماتے ہیں کہ مصرع ثانی میں موجود استعارے کے بے مثال حسن نے تمام شارحین کو اس درجہ مبہوت کر دیا ہے کہ مصرع اولیٰ پر توجہ کم صرف ہوئی ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ خود فاروقی صاحب کی توجہ مصرع اولیٰ پر کم صرف ہوئی ہے۔ اور جو توجہ انھوں نے اس مصرع پر صرف کی ہے وہ بھی ہمیشہ کی طرح Over Dose اس قدر ہوئی ہے کہ شعر کے مفہوم پر اس کا گہرا اثر پڑا ہے اور معنی ہی بدل کر رہ گئے ہیں۔

ذرا غور کیجئے شمس الرحمٰن فاروقی جیسا عالم اور دانشور جب ”غیب، غیب“ یعنی غیب کا نہ ہونا کہے یا غیب غیب کے معنی ہیں ظہور کہے تو ان کی علمیت پر شک ہونا لازمی

ہے۔ غالبؔ نے غیب غیب جس انداز میں کہا ہے اس کو سمجھنے کے لیے اس کہاوت سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے "انسان انسان ہے اور جانور جانور ہے" اب غیب غیب کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ غیب کی چیز ہے وہ غیب ہے اس کا کوئی ظہور نہیں۔ فاروقی صاحب نے اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے عدم عدم کے معنی وجود ہو سکتے ہیں کہا ہے۔ یہ نکتہ انھوں نے واقعی خوب نکالا ہے جس کی داد دینے کو جی چاہتا ہے لیکن غیب غیب کے معنی پھر بھی اپنی جگہ وہی ہیں ان کا بدلنا ممکن نہیں ہے۔ یعنی غیب تو محض غیب ہے۔

فاروقی صاحب نے جب الفاظ کے معنی ہی غلط لیے ہیں تو شعر کی شرح غلط ہونا ہی تھی۔ اور وہ ہوئی بھی ہے۔ ان کے مطابق جس کیفیت کو ہم شہود سمجھ رہے ہیں وہ تو محض ظہور کی کاریگری ہے، لیکن خود شہود کیا ہے؟ غالبؔ نے اپنے شعر میں یہ نہیں پوچھا ہے کہ شہود کیا ہے؟ پھر ظہور کی کاریگری شہود کو بنا کر غالبؔ کے مصرع کی معنویت ہی کو ختم کر دیا گیا ہے۔ جو چاہے فاروقی کا حسنِ کرشمہ ساز کرے جبکہ غالبؔ نے صاف طور پر کہا ہے کہ غیب محض غیب ہے جس کو ہم شہود سمجھ رہے ہیں یعنی ہم دھوکہ کھا رہے ہیں۔ یہ دھوکہ اسی طرح کا ہے کہ کوئی شخص خواب میں جاگ تو اٹھتا ہے اور دنیا جہاں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے لیکن بظاہر وہ جاگتا نہیں بلکہ سویا ہوا ہی رہتا ہے۔ اسے ہم کسی بھی طرح جاگا ہوا نہیں کہہ سکتے۔ یہ شعر کا لفظی ترجمہ ہوا۔

اب اگر اس کے مفہوم کے بارے میں غور و فکر کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ شعر خدا کی ذات کا مفہوم بیان کر رہا ہے۔ وہ غیب غیب ہے جس کو ہم شہود سمجھ رہے ہیں کیونکہ دونوں عالم کسی Supreme Power کی شہادت پیش کر رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ وہ خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہے جو غیب میں چھپا ہوا ہے اور ہم لوگوں یعنی دنیا والوں کی حالت یہ ہے کہ خدا کے راز کو پانے کی تلاش میں اپنی بیداری کا دعویٰ کرتے پھر رہے ہیں۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ ہم آج بھی ترقی کی کئی منزلیں طے کرنے کے باوجود اس سوئے ہوئے انسان کی طرح ہیں جو بظاہر سویا ہوا ہے لیکن خواب میں جاگا ہوا ہے اور خدا کے راز کو پالینے کی بات کر رہا ہے۔

معنی آفرینی، وسعتِ بیان اور فکر و خیال کے اعجاز سے بھرپور غیر معمولی اور لافانی

شعر کہہ دیا ہے غالبؔ نے۔ سنسکرت کے شاعر راجا بھر تروہری کا خیال جسے اردو کا جامہ ڈاکٹر اقبالؔ نے پہنایا ہے بے ساختہ مجھے یاد آگیا ہے پیشِ خدمت ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

{۱۳}

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

اس شعر کی شرح لکھنے والوں نے اسے صرف عاشق اور معشوق کے مضمون کی حد تک ہی سوچا ہے۔ غالبؔ کی وسعت و عظمت کا خیال کسی کو نہیں آیا آیئے عاشق و معشوق کے دائرے سے ذرا باہر نکل کر اسے وسیع پیانے پر سوچیں۔

اس میں نیا نکتہ یہ نکل سکتا ہے کہ اے خدا جب سے تیری گلی سے میں آشنا ہوا ہوں اور یہاں میرا آنا جانا ہوا ہے میں نے تیرے راز و نیاز کو بخوبی سمجھ لیا ہے۔ اب یہی سب باتیں سمجھانے کے لئے مجھے ان لوگوں کے در پر بار بار جانا پڑ رہا ہے جو مجھے مانتے نہیں ہیں اور تیرے راز و نیاز سے بے خبر ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ بھی نکلتا ہے کہ ایک زمانہ تھا جب میں گناہ اور شراب کے بارے میں امتیاز کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔ اب جب کہ یہ سب جان چکا ہوں اور خدا پرست بن چکا ہوں تو گناہ کرنے میں مجھے کچھ زیادہ ہی لطف آنے لگا ہے۔ میں بار بار اس در پر جاتا ہوں جہاں میرا رقیب یعنی شیطان موجود ہے۔ اس شعر میں جو تضاد ہے وہی شعر کا حسن ہے ایسا حسن غالبؔ کی شاعری میں جابجا جلوہ افروز ہے۔

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

زیرِ بحث شعر کے سلسلے میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا کہنا ہے کہ شعر میں "پھر" کے معنی "دوبارہ" نہیں ہیں بلکہ "تب" ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ شرح کی ابتدا کے پہلے ہی انہوں نے بھٹکنا شروع کر دیا ہے۔ بھلا غالب کو یہ کہنے میں کیا قباحت تھی "تب بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئی یار" بہ آسانی وہ "پھر" کی جگہ "تب" کا استعمال کر سکتے تھے لیکن پھر کے یہاں معنی دوبارہ ہی ہیں اور ہمیں شرح لکھنے میں اپنی مرضی سے کام نہیں لینا ہے بلکہ غالبؔ کے الفاظ کی روشنی ہی میں مفہوم کی تلاش کرنا شرح لکھنے کا حق ادا کرنا ہے۔

جو شرح فاروقی نے بیان کی ہے وہ ملاحظہ ہو، ٹھیک ہے، میں وہاں جاکر خود کو کھو آیا، مگر یہ کوئی خاص بات نہیں یا تشویش کا معاملہ نہیں گویا میں بنا ہی اسی لئے تھا کہ کوئے یار میں جاؤں اور اپنی ہستی کو وہیں گم یا محو کردوں اب جب کہ وہ بات ہو گئی ہے تو میں گویا اطمینان سے ہوں بلکہ میں بے خودی کو وہاں سے لے آیا اور خود کو وہاں چھوڑ آیا تو اچھا ہی ہوا ایک فکر اور کم ہوئی وہاں مجھ پر کیا گزری یہ معشوق جانے یا اس کی گلی کے لوگ۔ لفظ بے خودی بڑے معرکے کا ہے کیونکہ یہ اپنی خبر کو نہ جانے کا جواز بھی ہے اور اپنی خبر گم کرنے کی وجہ بھی۔ خوب شعر ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالبؔ کا ہر شعر یا تو خوب ہوتا ہے یا خوب سے خوب تر۔ اس لیے فاروقی کا یہ جملہ "خوب شعر ہے" محض رسمی ہو کر رہ جاتا ہے۔ چند فقرے اور غور و فکر کرنے کے لائق ہیں۔ مثلاً خود کو کھو دینا فاروقی کے نزدیک کوئی ایسی خاص بات یا تشویش کا معاملہ نہیں۔ غالبؔ کے شعر سے ایسا کوئی خیال ظاہر نہیں ہو رہا ہے نہ ہی اس کا اشارہ ہے کیونکہ وہ اپنی ذات کا احترام کرنے والا اور اسے سب سے زیادہ اہم اور قیمتی سمجھنے والا شاعر ہے۔ غالبؔ خود کو کھو دے اور

اسے تشویش نہ ہوا ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ خود کو کھودینے کے بعد اطمینان کی بات بھی کہی گئی ہے جب اطمینان ہو گیا تو بیخودی کہاں سے آ گئی؟ پھر وہ بیخودی کو وہاں سے لانے اور خود کو وہاں چھوڑ آنے کی بات کرتے ہیں یہ بھی شعر میں کہیں نہیں ہے بلکہ صاف یہ کہا گیا ہے کہ پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار۔ آگے ایک جملہ بیان کرتے ہیں کہ ایک فکر اور کم ہوئی۔ ؟ یہاں یک فکر اور کم ہونے سے کیا مراد ہے اور دوسری کونسی فکریں تھیں۔ پھر یہ کہنا کہ وہاں مجھ پہ کیا گزری یہ معشوق جانے یا اس کی گلی کے لوگ جانیں۔ یعنی جس پر گزری ہے وہ کچھ بھی نہیں جانتا ہے؟ لفظ "بے خودی" فاروقی صاحب کو بڑے معرکے کا نظر آ گیا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ان کی شرح بھی کم معرکے کی نہیں ہے۔ یہ لفاظی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے لیکن فاورقی کی لفاظی کی تو کوئی حد ہی نہیں ہے یہ تو ایک بے لگام گھوڑا ہے جس کی نہ تو کوئی سمت ہے نہ ڈھنگ کی چال۔ عجب بے ڈھنگی چال سے یہ بے لگام گھوڑا ہا گنے لگتا ہے۔ خیر آیئے اب شعر کی شرح پر بھی غور کر لیں۔

مجھ جیسے دیوانے کو تو اپنی خبر کوئے یار ہی میں جا کر ملتی ہے کیونکہ وہیں جا کر میرے ہوش ٹھکانے آتے ہیں ورنہ میں تو دیوانے کی طرح ادھر اُدھر بھٹکتے رہتا ہوں۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ مجھ پر بے خودی طاری ہو گئی ہے اور میں کوئے یار میں جانا بھول گیا ہوں اس بار یہ بے خودی ایسی طاری ہوئی ہے کہ اب کبھی کوئے یار میں جا نہ سکوں گا یعنی پہلے میری بے خودی کی شدت اس قدر نہیں ہوتی تھی کم از کم یہ تو ہوتا تھا کہ میں کوئے یار میں جانے کے قابل رہتا تھا اور وہاں جا کر مجھے اپنی خبر مل جایا کرتی تھی میرے ہوش ٹھکانے آجاتے تھے اس بار جو بے خودی مجھ پر طاری ہوئی ہے وہ عمر بھر کے لئے طاری ہوئی ہے ورنہ ایک دن میں کوئے یار میں پہنچ جاتا اور مجھے اپنی خبر مل جاتی میرے ہوش ٹھکانے آجاتے۔ اب کوئی بھی دن اب ایسا نہیں آنے والا ہے تمام عمر بے خبری میں گزر جائے گی۔ معرفت کا شعر ہے جس میں ترک دنیا ہی نہیں ترکِ محبوب کی منزل کا اشارہ ہے۔ یہ غالبؔ کا اصل مزاج ہے بے خودی پر میرؔ نے بھی بڑے ہی لافانی شعر کہے ہیں ان میں سے ایک یاد آرہا ہے جسے تحریر کر رہا ہوں ملاحظہ ہو۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو

دیر سے انتظار ہے اپنا

ایک خاص بات جس پر اب تک کسی کی نظر نہیں گئی ہے اس کا ذکر بھی کرتا چلوں ۔مصرع اولیٰ میں بھول گیا راہِ کوئے یار میں راہِ کا لفظ بھرتی کا ہے جب کوئے یار کہہ دیا تو "راہ" کی ضرورت ہی نہیں تھی کم از کم غالب کے یہاں تو یہ نہ ہونا چاہیئے۔

{۱۵}

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

بڑا ہی سادہ سا شعر ہے۔ مضمون بھی صاف ہے اور مفہوم بھی واضح ہے۔ لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے اس پر لمبی چوڑی بحث کی ہے انگریزی کے حوالے بھی دیئے ہیں ظاہر ہے کہ وہ ہر بات بڑی تفصیل سے کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ میں اسے اچھی ہی نہیں بہت اچھی بات سمجھتا ہوں اور انہیں داد دیتا ہوں۔ طویل بحث کے بعد شعر کی جو شرح انہوں نے لکھی ہے اس میں حسب عادت انہوں نے نئے نکتے نکالے ہیں اور غالبؔ کے اس شعر کو جس میں معنی آفرینی کی کمی تھی، زیادہ معنی آفریں بنادیا ہے۔ شرح ملاحظہ ہو۔

معشوق کے پاس بھی دو دنیائیں ہیں۔ ظاہر (یعنی اس کا جسم) اور باطن یعنی (اس کا دل) معشوق نے ظاہر و باطن سب بخش دیا اور سمجھا کہ میں مطمئن ہو جاؤں گا۔ لیکن میں مطمئن نہ ہوا اس لئے چپ رہا کہ تکرار (بہ معنی بحث یا دوہرانا) کیا کروں زیادہ لالچی بننا آداب کے منافی ہے۔

فاروقی صاحب نے ظاہر و باطن کی دو دنیائیں تو آباد کر دیں لیکن ظاہر و باطن کے جو معنی انہوں نے بیان کئے ہیں ان کی وضاحت ضروری ہے ظاہر کے معنی صرف انسان کا جسم ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ تمام عادت واطوار بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں جن کا مظاہرہ وہ کرتا ہے یعنی اچھائی، برائی، سچ، جھوٹ، فریب، خلوص، سادگی، سبھی انسان کے ظاہری فعل ہیں۔ اسی طرح باطن سے مراد فاروقی نے دل سے لی ہے۔ جبکہ باطن میں ضمیر بھی

شامل ہے بلکہ ضمیر کی اہمیت دل سے زیادہ باطن میں ہے۔

اب اگر شعر کے مفہوم کے بارے میں غور کریں تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ غالبؔ نے ظاہر وباطن دینے کی بات قطعی نہیں کہی ہے۔ کیا کسی کو یہ کہتے ہوئے کسی نے سنا ہے کہ لو میں اپنے ظاہر وباطن تمہیں دیتا ہوں؟ بلکہ ایسا جملہ بڑا ہی عجیب وغریب محسوس ہوتا ہے۔ ظاہر وباطن کسی کو دینے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ یہ وہ اوصاف ہیں جنہیں انسان خود برتتا ہے کسی کو دیتا نہیں ہے۔ جب ظاہر وباطن دینے کی چیزیں ہی نہیں ہیں تو فاروقی کا یہ نکتہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کہ معشوق نے اپنے محبوب کو اپنے ظاہر وباطن سونپ دیئے۔ تن من سونپنے کو ظاہر وباطن سونپنا قطعی نہیں کہا جاسکتا کہ کسی کے تن من سونپ دینے کے بعد بھی اس کے ظاہر وباطن اسی شخص کی ذات تک محدود رہتے ہیں۔ اس کی وضاحت ہم یوں بھی کر سکتے ہیں کہ ظاہر وباطن کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔ بڑی کھوج بین کے بعد فاروقی نے یہ نکتہ نکالا ہوگا لیکن افسوس کہ کارآمد ثابت نہ ہو سکا۔

اب شعر کی شرح ملاحظہ کریں۔ میرے محبوب نے مجھے اپنے دونوں جہاں دے کر یہ اطمینان کر لیا کہ میں خوش ہو گیا ہوں چونکہ اس کی خوشی ہی میں میری خوشی ہے اس لیے میں کوئی شکایت یا تکرار اس سے نہیں کر سکتا میری توقع سے اس کے دونوں جہاں کمتر تھے میں تو کچھ اور ہی چاہتا تھا اور میرے محبوب کے پاس بھی دونوں جہاں سے زیادہ کچھ اور تھا نہیں کہ وہ مجھے اور دے سکتا ایسے عالم میں میرے لئے تو شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر میں اپنے محبوب سے تکرار کیا کروں۔؟

دونوں جہان دینے اور دونوں جہان لٹانے کا محاورہ عام ہے اس کا سیدھا مطلب دونوں عالم سے ہے ایک زمین کی دنیا اور دوسری آسمان کی دنیا۔ غالبؔ کا اشارہ انہیں کی طرف ہے کسی کے ظاہر وباطن کی طرف نہیں۔

فیض احمد فیضؔ کا مشہور شعر ہے۔

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جارہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

دامن بچا کر گزرنے والا ہی صحیح معنی میں غالبؔ کی شاعری کو سمجھ سکتا ہے۔
شاداںؔ اندوری کا ایک شعر اور مجھے یاد آرہا ہے اس میں دونوں عالم کے مانگنے کی بات کہی گئی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

مانگنے والے نے بے سوچے دوعالم مانگے
دینے والے نے سمجھ کر دلِ ناکام دیا

بے سوچے مانگنا اور سمجھ کر دینا" میں جو فنّی لطف شاداںؔ اندوری نے پیدا کیا ہے شعر کا اصل حسن اسی میں ہے۔

ایک خاص بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ غالبؔ کا ذہن بہت ہی سلجھا ہوا ذہن تھا اس کے اشعار کے مفہوم کی تلاش طلسمی دنیا آباد کر کے ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اسی دنیا میں تلاش کرنا چاہیئے جہاں انسان بستے ہیں اس کے مضامین بھی اسی دنیا کے ہیں اور مفاہیم بھی۔ زیادہ تر شرح لکھنے والے اسی لئے بھٹک جاتے ہیں کہ وہ غالبؔ کی معنویت کو سمجھنے کے لئے کوئی اور ہی دنیا بسا لیتے ہیں جو Natural نہیں UnNatural ہوتی ہے جبکہ غالبؔ ایک Natural شاعر ہے لیکن غیر معمولی ہے۔

{۱۶}

کیا شمع کے نہیں ہیں ہواہ خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں؟

یہ شعر بظاہر سیدھا سادا ہے۔ لفظیات میں بھی مشکلات نہیں ہیں لیکن مضمون ایسا خوب باندھا ہے کہ غالبؔ کی ذہانت کی داد دینا ہی پڑتی ہے۔ جہاں تک غالبؔ کے اسلوب کی بات ہے ان کا رنگ و آہنگ ہی نہیں ان کی لفظیات میں بھی کچھ ایسی بات ضرور ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے مختلف اور منفرد نظر آئیں۔ اس شعر میں دو لفظ غالبؔ کی پہچان کے لئے کافی ہیں۔ مصرع اولیٰ میں انہوں نے "ہوا خواہ" کا استعمال کیا ہے کوئی عام شاعر ہوتا تو بھی خواہ ہی کہتا غالبؔ نے اپنے

انفرادیت کا ثبوت دیتے ہوئے ہوا خواہ کو ترجیح دی ہے۔ اسی طرح مصرع ثانی میں غم کو جاں گداز کہہ کر غالبؔ نے شعر میں معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر میں چھ نکتے نکالے ہیں اور الگ الگ ڈھنگ سے شرح بیان کی ہے ان کی کچھ باتوں پر غور فکر کیا جاسکتا ہے۔

(۱) دوسرے مصرع میں عام بات کہی گئی ہے کہ جب غم جاں گداز ہو تو غم خوار مجبور ہوتے ہیں۔

ہمیں فاروقی صاحب سے اختلاف یہ ہے کہ یہ عام بات نہیں ہے اس شعر میں اگر کوئی خاص بات ہے تو غم جاں گداز ہی ہے اس کے علاوہ شعر میں باقی سب باتیں عام ہیں شعر کا مرکزی خیال بھی غم جاں گداز ہی میں چھپا ہوا ہے۔

(۲) جلنے اور پگھلنے کا آسان علاج یہ ہے کہ شمع کو بجھا دیا جائے یعنی اس کی زندگی کو ختم کر دیا جائے رات ختم ہوتے ہوتے اس کو جل مرنا تو ہے ہی۔

فاروقی صاحب نے جلنے اور پگھلنے کا آسان علاج خوب ڈھونڈ نکالا ہے کہ شمع کی زندگی ہی ختم کر دی جائے اچھا ہوا کہ خدا نے فاروقی صاحب کو ڈاکٹر نہیں بنایا ورنہ ہر مریض کے لئے وہ آسان سا علاج یہی تلاش کرتے کہ اس کی زندگی ختم کر دیتے۔ شعر میں غالبؔ نے کہیں بھی شمع کو بجھانے یا اس کی زندگی ختم کرنے کا کوئی اشارہ نہیں دیا ہے۔

(۳) اگر شمع کا سر قلم کر دیا جائے تو اسکا کرب ختم ہو جائے گا شمع کا بجھ جانا اس کے حق میں اچھا ہی ہوگا۔ لیکن جب شمع بجھے گی تو اندھیرا ہو جائے گا اور اہل بزم اندھیرے میں رہ جائیں گے۔

بیچاری شمع کی اب خیر نہیں ہے کہ فاروقی صاحب اس کا سر قلم کرانے پر تل گئے ہیں لیکن انہیں ایک ہی بات پریشان کئے دے رہی ہے کہ شمع کا سر قلم ہوتے ہی اہلِ بزم اندھیرے میں رہ جائیں گے شمع کے سر قلم ہونے کا انہیں کوئی غم نہیں ہے بڑے سفّاک قاتل ہیں اللہ بچائے

(۴) انسان کی تقدیر ہی ایسی منحوس ہے کہ یا تو وہ بے اندازہ کرب سہے یا طبیب مرگ کی بھیانک چارہ گری قبول کرے۔

جہاں تک غالبؔ کا تعلق ہے وہ انسان کی زندگی کو پستی میں بھی بلندی کی نظر سے

دیکھنے کا عادی ہے انسان کی زندگی کو منحوس کہنا تو دور ایسا خیال بھی اس کے وہم وگمان میں نہیں آسکتا اور شعر میں بھی یہ بات کہیں نہیں ہے۔

(۵) اگر ہوا تیز ہو تو شمع بجھ جائے گی اور اسے جلنے سے چھٹکارہ مل جائے گا لیکن اگر ہوا نہ ہو تو شمع جل بھی نہیں سکتی کیونکہ جلنے کے لئے آکسیجن ضروری ہے۔

یہ سائنسی نکتہ ہے۔ بہت خوب جتنی داد دی جائے کم ہے۔ لیکن شمع کو بجھانے پر وہ اس قدر بضد کیوں ہیں یہ ہماری سمجھ سے پرے ہے ہو سکتا ہے کہ انہیں جلتی ہوئی شمع سے الرجی ہو۔ خیر۔ اب اس شعر کی شرح پر غور کریں۔

چونکہ شمع کا غم جاں گداز ہے اس کے جلنے سے تمام بزم روشن ہو جاتی ہے اور اہل بزم اس کی روشنی سے جاں گداز ہو جاتے ہیں اس لیے وہ اس کے بہی خواہ ہوتے ہوئے بھی اس کی غم خواری کا حق ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ کسی کا غم اہل بزم کے لئے جاں گداز بن جائے اس سے بڑا اعجاز اور کیا ہو سکتا ہے اور یہ اعجاز اشعار میں پیدا کرنے کا ہنر صرف اور صرف غالبؔ کو ہی آتا ہے بڑا ہی معنی آفریں شعر کہا ہے غالبؔ نے۔ اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ یہاں میں اپنا ایک شعر غالبؔ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔

شعر بڑا ہے برنگِ گل صد برگِ چمن
دیکھنے والے نے ہر لطفِ نظر سے دیکھا

{۱۷}

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رہ گزار بادیاں

یہ شعر شمس الرحمٰن فاروقی کے بے پناہ پسند آیا ہے اس کی تعریف بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں استعارہ اور پیکر کی بے نظیر خوبی کے باعث یہ شعر کلام غالبؔ میں بھی جگمگاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ دیوان غالبؔ میں استعارہ و پیکر کی وہ رنگا رنگی ہے کہ شبستاں میں تو خورشید کا عالم

نظر آتا ہے اس کے رتبے کا کوئی شعر نہیں بلکہ اس کے نزدیک بھی کوئی شعر نہیں پہنچتا یہ شعر تو رنگ سنگ ڈھنگ میں شاہوار ہے اور غالبؔ جیسوں سے بھی بہ آسانی نہیں بن سکتا۔

شعر کی اتنی تعریف دیکھ کر تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب کو یہ شعر بخوبی سمجھ میں آگیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی شرح کرنے میں بھی وہ کافی الجھے ہیں۔ مہر گردوں نے انہیں روشنی نہیں دکھائی ہے بلکہ ان کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ہے اور وہ راستہ بھول گئے ہیں۔

ابتداء تو انہوں نے بہت ذہانت سے کی تھی کیا غالبؔ نے سورج کے طلوع اور غروب سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اجزائے آفرینش روبہ زوال ہیں اور مہر گردوں کی حقیقت ہوا کے جھونکے کی راہ میں جلتے ہوئے چراغ سے زیادہ نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ خیال درست نہیں ۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ کم و بیش یہی شعر کی اصل شرح ہے۔اور غالبؔ نے یہی خیال ظاہر کیا ہے۔اس میں سورج کے طلوع اور غروب کی بات نہیں ہے نہ ہی ہوا کے جھونکے کا ذکر ہے ۔صرف ہوا کا ذکر ہے جھونکے اور ہوا میں فرق تو موجود ہے ہی بھلے ہی یہ فرق معمولی ہو۔

مزید کچھ معنی فاروقی نے اس طرح نکالے ہیں۔ مثلاً

(۱) مفہوم یہ نکلتا ہے کہ مہر گردوں یہاں چراغ رہ گزار کے مانند ہے جسے باد کہتے ہیں۔چراغ رہگزار کو ہوا کے مماثل ٹھہرانا مرگ پذیری کے لئے نہایت لطیف و نازک اور مناسب استعارہ ہے لیکن غالبؔ نے چراغ رہ گزار باد بہ معنی ہوا کے سامنے جلتے ہوئے چراغ کے طور پر ہی کہا ہے۔نہ کہ اس معنی میں جو معنی فاروقی نے اوپر بیان کئے ہیں۔

(۲) ایک اور نکتہ غور طلب ہے "مہر گردوں یعنی "گھومتا ہوا سورج"۔ سورج اپنے محور پر گردش کرتا ہے اس کی یہ مسلسل گردش اس کے شعلے کو بھڑکاتی ہے۔ شعلہ جتنی جلدی بھڑکتا ہے اتنی جلدی وہ فرو بھی ہو جاتا ہے۔

مہر گردوں کے معنی گھومتا ہوا سورج قطعی نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ہیں آسمان کا سورج گردوں کے معنی آسمان بھی ہے اور گھومتا ہوا آسمان بھی ہے صرف گھومنا نہیں ہے

۔ویسے بھی سائنسی نکتہ نظر سے چاند زمین کا چکر لگاتا ہے اور زمین سورج کے آس پاس چکر کاٹتی ہے جبکہ سورج اپنی جگہ پر بدستور موجود رہتا ہے وہ کسی محور پر نہیں گھومتا اسے تو فاروقی صاحب کی علمیت ہی گھومنے پر مجبور کر سکتی ہے۔

زیر بحث شعر دراصل تمام مخلوق کے اجزا کے عروج وزوال کا بیان ہے غالبؔ نے کہا ہے کہ اس دنیا کے تمام اجزا عروج کے بعد زوال آمادہ ہو جاتے ہیں یعنی جو پیدا ہوتا ہے وہ ایک دن فنا بھی ہو جاتا ہے۔اس دنیا میں آسمان کے سورج کی حقیقت ہوا کے سامنے جلتے ہوئے چراغ سے زیادہ نہیں ہے جس طرح چراغ کو راستے کی ہوا جلاتی بجھاتی رہتی ہے اسی طرح وقت کی ہوارات اور دن کی طرح آسمان کے سورج پر اثرانداز ہوتی ہے اور سورج جلتا اور نکھار رہتا ہے اس کے بعد اس شعر کو سمجھنے کے لئے کچھ اور کہنے یا بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہی اور بے ضرورت لفاظی کرنے کی ہماری عادت بھی نہیں ہے۔اسلئے خدا حافظ۔

{۱۸}

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کے شاد نہیں

شعر بظاہر سادہ ہے لیکن اسے سمجھنے کے لئے بھی غالبؔ کے تیور کو سمجھنا نہایت ضروری ہے۔جسے سمجھنے سے شارحین قاصر رہے ہیں۔ نظم طباطبائی نے اس کی شرح یوں بیان کی ہے۔"مصنف نے یہ تازگی پیدا کی ہے کہ غم وشادی کے بہم ہونے پر حسرت ظاہر کی ہے۔کہتے ہیں ہمیں کیا کام۔یعنی ہم تو محروم ہیں۔ہمیں تو کبھی ایسی خوشی بھی حاصل نہیں ہوئی جو غم سے متصل ہو اور شادی مخلوط بہ غم کی حسرت کرنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ شاعر کو انتہائی غم زدگی ہے کہ اس ہیچ وہ ناکارہ خوشی کی تمنا کرتا ہے۔

اس شرح پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف کا یہ خیال قطعی نہیں ہے کہ وہ شادی مخلوطہ بہ غم کی حسرت میں مبتلا ہے۔غالبؔ جیسا خوددار اور انا پرست شاعر ایسا ہرگز

نہیں ہے کہ وہ غم سے مستقل خوشی کی حسرت کرنے لگے۔اس شعر کو سمجھنے کے لئے غالبؔ کی بے نیازی اور دیوانگی کو مد نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ہم جب شرح لکھیں گے تو اس کی مزید وضاحت کریں گے۔فی الحال فاروقی کی شرح پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے زیر بحث شعر کی شرح یوں بیان کی ہے۔ غم وشادی کا بہم ہونا قانون وفطرت ہے قرآن میں ارشاد ہوا ہے اِنّ مَعَ العُسرِیُسراًاِنّ مَعَ العُسر یُسرا(بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے)اگر غم ہوگا تو خوشی بھی ہوگی اور خوشی ہوگی تو غم بھی ہوگا۔لیکن ہمارا المیہ یہ نہیں کہ ہمارے دل میں غم ہی غم ہے۔دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں۔انتہائی بلیغ عبارت ہے۔اگر یہ کہا ہوتا کہ خدا نے ہمکو وہ دل دیا ہے جو سراسر مملو از غم ہے تو اور بات ہوتی کہا یہ ہے کہ ہمارا دل وہ دل ہے جو شاد نہیں۔ مفہوم یہ نکلا کہ دل یکسر خالی ہے اس میں غم بھی نہیں ہے کیونکہ خدا نے غم دیا ہوتا تو خوشی بھی عطا کرتا۔جب غم نہیں دیا تو گویا کچھ نہیں دیا۔

فاروقی صاحب نے ہر طرح شعر کا مفہوم بیان کرنے کی کوشش کی ہے لیکن مزاج غالبؔ کے تیور پر روشنی انہوں نے بھی نہیں ڈالی ہے جو اس شعر کی جان ہے۔اس شعر کی شرح یوں ہونا چاہیئے۔بھلے ہی غم اور خوشی ساتھ ہوں مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔میں ان سے بالکل بے نیاز ہوں مجھ پر نہ غم کا اثر ہوتا ہے نہ خوشی کا۔

خدا نے مجھے ایک ایسا دل عطا کیا ہے جو کسی طرح بھی شاد نہیں ہوتا۔یعنی میری ہستی وہ ہے جو غم اور خوشی کی گرفت سے آزاد ہے۔میں اپنی دھن میں مست وبیخود ہوں غم اور خوشی جیسی معمولی چیزیں مجھے قطعی متاثر نہیں کرتیں ہیں۔اس کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اور اس بے خبری کے عالم میں غالبؔ سے شعر میں ایک فنی غلطی سرزد ہوگئی ہے مصرع اولیٰ پر غور کریں پہلے غالبؔ نے کہا ہے "جہاں میں ہوں" اور دوسرے ہی لمحے وہ کہتے ہیں "ہمیں کیا

کام "یا تو نہیں "مجھے کیا کام" کہنا چاہیئے تھا یا پھر "جہاں ہم ہیں" کہتے اس میں کوئی دشواری نہیں تھی ۔اس ذرا سے فنی نقص کے لئے غالبؔ جیسے عظیم شاعر کو اسلئے معاف نہیں کیا جاسکتا کہ تیسرے چوتھے درجے کے شعراء کے یہاں بھی ایسی کوئی غلطی ہوتی ہے تو اہل نظر انہیں بخشتے نہیں ہیں پتہ نہیں شرح لکھنے والے تمام عالموں کی نظر غالب کی اس غلطی پر کیوں نہیں پڑی۔؟

{۱۹}

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

شعر میں غالبؔ کی انا پرستی کا مظاہرہ بالکل صاف ہے لیکن اس تیور کا بیان کم ہی ہوا ہے زیادہ تر شرح کرنے والوں نے غالبؔ کی بے بسی اور محرومی کا ذکر کیا ہے جو غالبؔ کے ساتھ ناانصافی ہی نہیں دھاندلی ہے۔ مثال کے طور پر۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) مجھ پر لعنت ہے کہ میں پتھر نہیں ہوں اگر ہوتا تو تیرے در پر دائم پڑا رہنے کی سعادت نصیب ہوسکتی تھی۔

ذرا سوچیۓ انسان کی عظمت کو جاننے اور سمجھنے اور اس پر ناز کرنے والا غالبؔ جیسا شاعر کس قدر بے غیرت اور بے بس ہوسکتا ہے کہ خود پر لعنت بھیجنے لگے اور ایک معمولی راہ کے پتھر کی زندگی قبول کرنے کے لئے بے قرار ہو اٹھے ؟ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ایک بے حس و حرکت کو خود سے زیادہ اہمیت غالبؔ دے ہی نہیں سکتے۔ جس نے بھی اس شعر کی ایسی شرح لکھی ہے اس نے غالبؔ کو دراصل سمجھا ہی نہیں ہے۔

(۲) بے خود موہانی کی پیروی کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی بیان کرتے ہیں۔ میری زندگی جو انسانی ہونے کے باعث کم دوام رکھتی ہے کس قابل ہے ؟ کاش میں پتھر ہوتا تو مجھے تیرے در پر سیکڑوں سال پڑے رہنے کی سعادت نصیب ہوتی اس کی مثال یوں دی گئی ہے کہ سنگی مجسمے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں برس قائم رہتے ہیں غور و فکر کی بات یہ ہے کہ غالبؔ زندگی پرست تھے مجسموں میں

زندگی نہیں ہوتی ہے وہ تو بے حس و حرکت ہوتے ہیں۔ان کی طرفداری غالبؔ نہیں کر سکتے۔

دراصل اس شعر میں دائم اور پتھر کے الفاظ نے ہر ایک شرح نگار کو خاصا پریشان کیا ہے ۔ان کی عقل پر ایسے پتھر پڑے ہیں کہ ان پتھروں کی بارش میں وہ غالبؔ کے شعر کا مفہوم تلاش کرنا بھول گئے ہیں۔اور انہیں انسانی زندگی سے زیادہ ایک پتھر کی اہمیت کا بے جا احساس ہونے لگا ہے۔

غالبؔ کے زیر بحث شعر کی شرح غالبؔ کے تیور اور مزاج کے مدِ نظر یوں ہو گی کہ ......اے میرے محبوب تو نے آخر مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔میں انسان ہوں تیرے در پر دائم پڑے ہوئے پتھر کی طرح نہیں ہوں بلکہ میں تو اس پتھر کی زندگی پر لعنت بھیجتا ہوں جو بے حس و حرکت کسی مجبور و بے حس کی طرح دائم پڑا ہوا ہے۔یعنی میں مجبور و بے حس نہیں ہوں ہر طرح سے آزاد ہوں جہاں چاہوں آجا سکتا ہوں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔خود مختار ہوں تجھ سے عشق کرنے کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ ایک پتھر کی طرح میں ہمیشہ تیرے قدموں میں پڑا رہوں اور تو مجھے چاہے جب ٹھوکریں مارتا رہے۔کیونکہ پتھر تو ٹھوکریں ہی کھاتا رہتا ہے۔انسان کی زندگی کے عزو وقار اور ایک بے جان پتھر کی بے بسی کی معنویت کا یہ بے مثال شعر غالبؔ کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی سمجھ کے لئے غالبؔ دل غالبؔ دماغ اور غالبؔ کی شخصیت کے ہر پہلو سے گزرنا پڑتا ہے تب ہی صحیح منزل مل پاتی ہے ورنہ اس گلی سے گزرنے میں عقل پر پتھر پڑتے دیر نہیں لگتی ہے۔

{۲۰}

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

شعر جتنا سادہ ہے اتنا ہی معنی آفریں ہے غالبؔ نے اس شعر میں بھی اپنی شخصیت کی انفرادیت اور برتری کا احساس دلایا ہے۔اس شعر کی عالموں نے جو شرحیں بیان کی ہیں ایک سرسری نظر ان پر ڈال لیں۔

(۱) بے خود موہانی لکھتے ہیں......بلبلوں نے مجھے دیکھ کر نغمہ سرائی شروع

کر دی، جس طرح استاد کو دیکھ کر بچے سبق پڑھنے لگتے ہیں۔

(۲) آسی لکھتے ہیں.... میں فصیح البیان تھا اسلئے بلبلوں نے بھی میری نقل شروع کر دی۔

(۳) مولانا غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ میرے نالوں سے بلبلوں پر اتنا اثر پڑا کہ وہ زمزمہ بار ہو گئیں گویا چمن نہ تھا ایک مکتب تھا جس میں بچے آموختہ یاد کر رہے ہیں۔

(۴) فاروقی زیر بحث شعر کی شرح کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔ "دبستاں" دراصل "ادبستاں" کا مخفف ہے یعنی دبستاں وہ جگہ ٹھہری جہاں شعر و ادب کا چرچہ ہوتا ہے۔ میں نالہ کرتا ہوا چمن میں گیا۔ میرا نالہ بھی اس قدر موزوں اور شاعرانہ تھا کہ بلبلوں کو اس کے جواب میں غزل خواں ہونا پڑا۔ لفظ "غزل خواں" کی یہاں خاص اہمیت ہے کیونکہ بلبل تو نغمہ زن یا نالہ زن ہوتی ہے اب جو اس نے میرا نالہ موزوں سنا تو اسے محسوس ہوا کہ اس کے جواب میں عام نغمہ سرائی کافی نہیں بلکہ غزل خوانی درکار ہے۔

مندرجہ بالا شرحوں پر غور و فکر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سب ہی نے قریب ایک ہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اس منظر کے پس منظر میں جھانکنے کی کسی نے بھی ضرورت نہیں محسوس کی۔ شاعر جو کچھ بیان کرتا ہے کئی بار وہ الفاظ سے زیادہ پس الفاظ بھی ہوتا ہے۔ اس شعر میں پس الفاظ بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ جہاں تک فاروقی صاحب کے نظریئے سے "دبستاں" کی جگہ "ادبستاں" کا سوال ہے تو ان کا خیال غلط ہے غالبؔ کا اشارہ دبستاں سے ہی ہے۔ یعنی مکتب۔ ادب کدہ قطعی نہیں۔ کیونکہ اس شعر میں غالبؔ نے خود کو سب کا استاد کہنے کی کوشش کی ہے اور دیگر تمام ہم عصروں کو مکتب کے بچے کہا ہے بچوں کے لئے بلبلوں کی مثال بڑی معنی خیز ہے اس پر غزل خواں نے شعر کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔

اب شرح ملاحظہ ہو۔۔۔ میں دنیا جہان سے گھبرایا ہوا چمن کی سیر کرنے اور اپنا جی بہلانے گیا تھا لیکن وہاں بھی میرا جی نہیں بہلا الٹا میرے نالے وہاں بھی بلند ہونے لگے بلبلوں نے میرے نالے جب سنے تو انہوں نے مجھے پہچان لیا کہ یہی اردو کا عظیم شاعر غالب ہے جس کی غزلوں کی سارے جہاں میں دھوم مچی ہوئی ہے۔ میرے نالوں کا اثر ان پر ایسا ہوا

کہ وہ نغمہ سرائی بھول کر غزل خواں ہو گئیں لیکن انکی غزل خوانی میں وہ بات کہاں تھی جو میرے کلام میں ہے یا میری غزلوں میں ہے ان کی غزل خوانی تو محض مکتب کے بچّوں کا آموختہ یاد کرنے جیسا ایک شور تھا اس شور کو میں نے ایک استاد فن کی طرح محسوس کیا۔

ایک نکتہ یہ بھی نکلتا ہے کہ میری غزلوں کی شہرت ادبی محفلوں اور شہروں تک ہی محدود نہیں تھی۔بلکہ تمام عالم میں ان کا چرچا تھا ایک بار میں چمن میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بلبلیں بھی میری غزلیں گانے لگیں یعنی ان تک میری غزلیں پہلے ہی پہنچ چکی تھیں ورنہ وہ غزل خواں نہ ہوتیں بلکہ نغمہ سرائی کرتیں۔ان تمام بلبلوں نے بھی میرا احترام ایک استاد فن کی طرح کیا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری شہرت انسانوں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ پرندے اور دیگر مخلوق میں بھی میری غزلوں کا چرچا تھا۔ شعر کیا ہے عظمت و وسعت کا شاہکار ہے۔

{۲۱}

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار

جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

شمس الرحمٰن فاروقی کا خیال ہے کہ اس شعر میں بظاہر کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔اگر ایسا ہوتا تو اس کی شرح بیان کرنے میں کوئی الجھن کسی کو نہ ہوتی اور مفہوم بھی واضح ہو جاتا۔لیکن ایسا نہیں ہوا ہے سب ہی نے دھوکہ کھایا ہے۔

بیخود موہانی نے اس کی شرح یوں بیان کی ہے۔"اس نے مجھے کبھی نظر بھر کر نہ دیکھا۔پھر بھی میرے دل کا یہ حال ہوا جاتا ہے۔کبھی آنکھ ملا کر دیکھتا تو کیا حالت ہوتی۔" آسی فرماتے ہیں۔"دل میں ہر وقت ایک کھٹک سی رہتی ہے اگرچہ نگاہیں چھوٹی ہیں۔"

جوش ملسیانی کا خیال ہے کہ۔نگاہیں میری قسمت کی کوتاہی کے سبب سے بوجہ شرم مژگاں بن کر رہ گئیں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی نے زیر بحث شعر کی شرح یوں بیان کرنے کی کوشش کی ہے جسے محض کوشش ہی کہا جا سکتا ہے کہ صحیح

شرح یہ بھی نہیں ہے۔ فاروقی کہتے ہیں کہ نگاہ کی صنعت طوالت ہے لیکن میری قسمت اتنی چھوٹی (نارسا) ہے کہ اس کے اعتبار سے معشوق کی نگاہ بھی چھوٹی ہی رہی اور اتنی چھوٹی کہ آنکھ سے نکلی نہیں اس کی جگہ صرف مژگاں کا عمل دخل رہا یعنی جب اس نے میری طرف رخ کیا بھی تو دیکھا نہیں میں نے صرف اس کی مژگاں کو متوجہ پایا۔ اس کی نگاہ کو نہیں۔

ہمارے حساب سے کوتاہی قسمت۔ اور نگاہوں کا مژگاں ہونا سمجھنا بہت ضروری ہے۔ بیخود موہانی نے کوتاہی قسمت کا ذکر ہی نہیں کیا نہ ہی انہوں نے نگاہ کے دل کے پار ہو جانے ہی پر روشنی ڈالی ہے۔ آسی نے نگاہوں کے چھوٹی ہونے کی بات کہی ہے نگاہ کے چھوٹے بڑے ہونے کا بھی کیا کوئی پیمانہ ہے ؟ اس کا جواب شاید کوئی نہ دے سکے کیونکہ نگاہ گہری، تیز، قاتل تو ہو سکتی ہے چھوٹی بڑی نہیں ہو سکتی۔ فاروقی نے نگاہ کے ساتھ قسمت کو بھی چھوٹی کہا ہے جو عجیب لگتا ہے آگے انہوں نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے بد نصیبی ضرور کہا ہے۔ لیکن شعر میں جیسا کہ فاروقی نے فرمایا ہے مژگاں کے متوجہ ہونے کا کہیں کوئی اشارہ نہیں ہے۔ غالب نے نگاہ کے مژگاں بننے کا خیال ظاہر کیا ہے۔

شعر کی شرح ملاحظہ ہو۔ میری بد نصیبی سے یار کی وہ نگاہیں جو اس کی مژگاں تک آکر ٹھہر گئی تھیں مجھ پر ان کا اثر بھی ایسا ہے کہ وہ میرے دل کے پار ہوئی جا رہی ہے۔

ایک نکتہ یہ ہے کہ میری اپنی نگاہیں جو مژگاں تک آکر ٹھہر گئی تھیں اور میں جن سے اپنے محبوب کو دیکھ بھی نہیں پایا تھا اب ان کا رخ میرے ہی دل کی طرف ہو گیا ہے اور وہ جن کو محبوب کے دل کے پار ہو جانا چاہیئے تھا اب میرے ہی دل کے پار ہونے لگی ہیں اور یہ سب اسلئے ہوا ہے کہ میں بد نصیب ہوں ایک نکتہ اور بھی نکل سکتا ہے۔

جب میری اپنے محبوب سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس کی نگاہیں میری مژگاں تک آکر رک گئیں لیکن وہ تو کچھ دم کے لئے رکی تھیں اب وہی نگاہیں میری اپنی مژگاں سے چل کر میرے دل کے پار ہو رہی ہیں اور میں تڑپ رہا ہوں یہ سب میری بد نصیبی کی وجہ سے ہے ورنہ میں نے تو ان کی نگاہوں کے وار کو اپنی مژگاں کی ڈھال پر جھیل لیا تھا یا روک لیا تھا۔ رومانی انداز کا جاں گداز شعر ہے جس میں غالب نے ایک خوبصورت مضمون باندھا ہے۔ اس میں بھی ان کی ذہانت نے ایک خوبصورت

مضمون باندھا ہے۔ اس میں بھی ان کی ذہانت کار فرما ہے۔

{۲۲}

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

عام طور پر اس شعر کی شرح یوں بیان کی گئی ہے کہ جام شراب ہاتھ میں آجائے تو روح بالیدہ ہو جاتی ہے کیونکہ ہاتھ کی لکیریں شہ رگ بن جاتی ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس سے مطمئن نہیں ہیں ان کے حساب سے ایک تو شعر میں شراب کے جاں فزا ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے دوسرے ہاتھ کی لکیروں کے رگ جاں بننے کا بھی کوئی ثبوت شعر میں نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ شاعری میں ہر لفظ یا ہر خیال کا ثبوت پیش کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے۔ دیگر شعرا کی بات جانے دیجئے میرؔ اور غالبؔ ہی کے سینکڑوں اشعار ایسے مل جائیں گے جن میں بات کہہ دی گئی ہے اس کا ثبوت نہیں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ان میں کہیں کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا گیا ہے۔

(۱) دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے (غالبؔ)

(۲) ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی (غالبؔ)

(۳) دیکھ تو دل کے جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے (میرؔ)

(۴) غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں (غالبؔ)

پہلے شعر میں دل ناداں کو کیا ہوا ہے کیوں ہوا ہے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے دوسرے میں ہم وہاں ہیں یعنی کہاں ہیں ؟اور کچھ ہماری خبر نہیں ؟ کیوں نہیں ؟دونوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ تیسرے شعر میں دل اور جاں سے دھواں کیوں اٹھ رہا ہے اس کی نہ تو کوئی وجہ بتائی گئی ہے نہ ہی ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔ چوتھے شعر میں پیتا ہوں روز ابر وشب ماہتاب میں تو پوچھا جاسکتا ہے کہ آخر کس لئے ظاہر ہے کہ اس کا بھی شعر میں کوئی ثبوت نہیں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن غالبؔ اور میرؔ کے یہ اشعار وہ ہیں جو مقبول عام ہی نہیں بلکہ ادب میں بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔

فاروقی نے زیر بحث شعر کی شرح کچھ یوں بیان کی ہے۔ جام میں سرخ شراب بھری ہوئی ہے (کیا ضروری ہے کہ سرخ رنگ کی شراب ہی جام میں ہو؟) جام ہاتھ میں ہے شراب کی سرخی جام سے چھلک کر ہاتھ پر آتی ہے تو ہاتھ کی لکیریں سرخ معلوم ہوتی ہیں گویا ہر لکیر زندہ خون سے بھری شہہ رگ دکھائی دیتی ہے اور جب ہاتھ کی خشک لکیریں بھی خون رواں سے پر نظر آئیں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شراب میں افزائش جاں کی قوت ہوتی ہے۔ اس شرح کی روشنی میں شعر کے تمام الفاظ کارگر نظر آتے ہیں۔ فاروقی کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کیا ضروری ہے کہ جام اٹھانے والے ہاتھ کی لکیریں خشک ہی۔ کوئی جواں مرد بھی تو یہ جام اٹھاسکتا ہے جس کے بدن میں خون کی افراط ہو۔ خیر.......

جہاں تک ہم نے اس شعر کو سمجھا ہے اس کے حساب سے اس کی شرح یوں ہونی چاہئے.... چونکہ شراب جاں فزا ہے مسرت انگیز ہے اسلئے جیسے ہی ہاتھ میں جام آتا ہے مارے خوشی کے ہاتھ کی لکیروں میں ایک نئی زندگی دوڑ جاتی ہے۔ ہاتھ کے لکیروں کے رگ جاں ہونے سے مراد یہ بھی لی جاسکتی ہے کہ ایک نئی زندگی کا احساس ہونے لگتا ہے علم نجوم کے حساب سے انسان کی زندگی ہاتھ کی لکیروں کے مطابق ہی چلتی ہے اور بدلتی ہے گویا جام شراب کا ہاتھ میں آنا قسمت بدلنے اور ایک نئی زندگی کے آغاز ہونے جیسا ہے غالبؔ نے اس شعر میں اپنے علم نجوم سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جیسا کہ انہوں نے ایک خط میں ظاہر کیا ہے اور جس کا ذکر تفہیم غالبؔ میں شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی کیا ہے۔

غالبؔ انوار الدولہ شفق کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "آرائش مضامین شعر کے واسطے کچھ تصوف کچھ نجوم لگا رکھا ہے ورنہ سوائے موزونی طبع کے یہاں اور کیا رکھا ہے۔"

حکمت اور علم نجوم میں زیادہ تر شعراء کی دلچسپی رہی ہے مومن خاں مومن جو کہ غالبؔ کے ہم عصر تھے اعلیٰ درجے کے شاعر تو تھے ہی بہترین حکیم اور ماہر علم نجوم ایسے تھے کہ اپنی موت کے بارے میں پہلے ہی سے انہوں نے اپنے گھر والوں کو بتادیا تھا۔ علم نجوم کے ان کے کئی قصے مشہور ہیں۔ ان کا ذکر پھر کبھی۔

{۲۳}

ہم موحدؔ ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

شعر کا مضمون اور مفہوم بالکل صاف ہو پھر بھی اگر شرح لکھنے والے الجھن کے شکار ہو جائیں تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ جب تک شاعر کے مزاج اور شخصیت کو نہ پہچانا جائے اس کی تخلیق کی صحیح طور پر وضاحت نہیں کی جاسکتی۔

مولانا حالیؔ اور بےخودؔ دہلوی نے اس شعر کی شرح کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ مذاہب اور ملتیں محض رسوم کی طرح۔ ظاہری اور سطحی ہیں لہٰذا ان کے مٹنے کے بعد ہی ایمان قائم ہوتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ غالبؔ نے ملتیں مٹنے کی بات کہی ہے وہ ملتیں جو رسموں کی بنیادوں پر چلتی ہیں جبکہ مذہب کے مٹنے کی بات نہیں ہے اس نے صاف کہا ہے ہمارا "کیش" ہے یعنی ہمارا "مذہب" ہے۔ (کیش بہ معنی مذہب) پھر اجزائے ایماں ہونے میں ایمان کی سلامتی کی طرف اشارہ ہے اور ایمان دین سے یا مذہب سے جڑا ہوا ہے اگر ایمان ہے تو مذہب ضرور ہوگا۔ اسلئے غالبؔ مذہب کا مخالف نہیں ہے ان فرقوں کا مخالف ہے جو مذہب میں کئی رسموں کی ترغیب دیتے ہیں اسلئے ان فرقون کے مٹنے اور ترک رسوم کو وہ ضروری سمجھتا ہے ایمان کی سلامتی کے لئے۔

یوسف سلیم چشتی نے موحد کے معنی "مومن" بتائے ہیں جو غلط ہیں۔ موحد کے صحیح معنی وحدانیت میں یقین رکھنے والا یا ایک خدا کی ذات کو ماننے والا۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر کی شرح یوں بیان کی ہے۔ کہ موحد ہونے کی حیثیت سے ہم جانتے ہیں کہ مذہب نہ رکھنا ہی اصل مذہب ہے۔ موحد کے معنی بھی وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ شخص جو خدا کی وحدت کا قائل ہے لیکن مذہب کا قائل نہیں غلط ہے ہماری شرح ملاحظہ کریں سارا منظر صاف ہو جائے گا۔

ہم وحدانیت کے ماننے والے ہیں ہمارا مذہب پرانی گھسی پٹی رسموں روایتوں کو ترک کر دینا ہے۔ کیونکہ مذہب میں پھیلی ہوئی فرقہ واریت جب مٹتی ہے تو ایمان کے جزبن جاتے ہیں یعنی سچے مذہب اور ایمان والے ایک جٹ ہو جاتے ہیں۔ غالبؔ نے اس شعر میں وحدانیت کے مذہب اسلام کی زبردست پیروی کرتے ہوئے اس میں پھیلی فرقہ واریت پر زبردست چوٹ کی ہے۔ مذہب سے انکار کرنے اور مذہب کو مٹانے کی بات اگر غالبؔ کو کہنا ہوتی تو وہ بہ آسانی یہ کہہ سکتے تھے۔ "ہم تو منکر ہیں۔۔۔۔" لیکن انہیں مذہب سے انکار قطعی نہیں تھا۔ اگر ایسا ہی ہوتا تو وہ یہ مقطع بھی نہیں کہتے۔

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوترابؔ میں

{۲۴}

شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دیوانگی کے علم کی انتہا کی تصویر کشی اس شعر میں بخوبی کی گئی ہے۔ مفہوم صاف ہے کہیں کوئی پیچ نہیں ہے لیکن شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کے مفہوم کو پیچ دار بنانے کی کوشش کی ہے وہ فرماتے ہیں شعر کا متداول مفہوم لطف سے عاری ہے۔ میرا سر کاندھے کے لئے وبال ہے

کاش کے صحرا میں کوئی دیوار ہوتی تو میں سر پھوڑ ڈالتا۔اگر مفہوم یہی ہے تو شوریدگی کے وفور کے باعث صحرا میں آنا بے معنی ہوا جاتا ہے۔شوریدگی کا وفور اس قدر ہے کہ سر وبال دوش ہے اسے پھوڑ ڈالنے کی دھن ہے۔لیکن اگر ایسا تھا تو گھر سے صحرا میں آنا چہ معنی دارد ؟ گھر میں دیواریں ہی دیواریں ہیں وہیں سر پھوڑ ڈالے اگر یہ کہا جائے کہ گھر منہدم ہو گیا ہے اس میں دیواریں کہاں ؟ تو سر پھوڑنے کے لئے شہر کی کوئی دیوار کوئی چوکھٹ کافی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ گھر سے صحرا میں آنے کے معنی نہیں ہیں۔نہ ہی گھر منہدم ہونے کی کہیں بات کہی گئی ہے۔یہ ضروری نہیں کہ گھر سلامت ہو تو دیوانہ صحرا کی طرف نہ نکلے۔دراصل فاروقی ڈال ڈال پات پات گھومنے میں شعر کی جڑ کو نظر انداز کر گئے۔اس شعر کی جڑ ہے جنون مجنوں ۔اردو شاعری میں مجنوں کی دیوانگی کو مرکز خیال بنا کر شعر کہنے کی عام روایت رہی ہے۔دیوانگی کے عالم میں مجنوں کا صحرا میں بھٹکنا اور جنون کی انتہا کو پہنچ جانا ہی اس شعر کا اصل مضمون ہے۔

دراصل صحرا میں قدم رکھنا ہی جنون کی انتہا ہے۔جنون چونکہ سر میں ہوتا ہے اسلئے جنونی اپنا سر دیوار سے ٹکراتا اور راحت محسوس کرتا ہے۔لیکن صحرا میں کوئی دیوار نہ ہونے کی وجہ سے سر کا دیوار سے ٹکرانا بے چینی اور انتشار کا سبب بن گیا ہے۔ایسے عالم میں جنون کی شدت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور راحت کا کوئی سامان نظر نہیں آتا۔اب بس جنون ہی جنون رہ جاتا ہے۔اس کا علاج ایک ہی ہے کہ کسی دیوار سے سر پھوڑ لیا جائے لیکن صحرا میں تو دیوار بھی نہیں ہے کہنے کا مطلب ہے یہ ہے کہ مرض لاعلاج بن گیا ہے اب اس کا کوئی علاج ممکن ہی نہیں ہے۔دیوانہ خدا سے شکایت کر رہا ہے اے خدا اس صحرا میں ہر طرف دھوپ ہی دھوپ ہے جو میرے جنون کی شدت کو اور بڑھا رہا ہے۔یہاں کوئی دیوار بھی نہیں ہے یعنی دھوپ تو ہے دیوار بھی نہیں ہے ورنہ میں اپنا سر پھوڑ کر راحت محسوس کر لیتا۔

''صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں کہہ کر غالبؔ نے جنون کو جاوداں بنا دیا ہے۔اپنے مرض کو لاعلاج بنا کر درد کو جاوداں بنا دینا اس کی صفت میں ایک نئی صفت پیدا کر دینا غالبؔ کے فن کا اعجاز ہے۔یہ ان کے بیشتر اشعار میں جابجا ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔مثلاً

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

{۲۵}

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مرزا غالبؔ نے شعر کہنے میں کمال کیا ہے لیکن ان کے اشعار کی تشریح لکھنے والے باکمالوں نے تو اپنی سوجھ بوجھ کے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ بس حد ہی کر دی ہے۔ زیر بحث شعر کو وصل کے وقت ہاتھاپائی کے مضمون کا شعر بھی کہا ہے۔ خدا غالبؔ کی شاعری کو ایسے شراح سے محفوظ رکھے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر میں بھی چار پانچ نکتے تو نکال ہی لئے ہیں۔ مثلاً

(۱) اگر عام مفہوم لیا جائے تو دوسرے مصرع میں "تلوار بھی نہیں" کے بجائے "تلوار ہی نہیں" کا محل تھا۔

اگر غالبؔ شمس الرحمٰن فاروقی کی اصلاح کے مطابق شعر کہتے اور "بھی" کی جگہ "ہی" رکھتے تو سوال یہ پیدا ہو جاتا کہ ایک تلوار ہی ہاتھ میں نہیں ہے باقی تمام ہتھیار ان کے ہاتھ میں ہیں ظاہر ہے کہ اصلاح شعر کا چہرا بگاڑ رہی ہے۔ یہاں "تلوار بھی نہیں" کا استعمال ہی درست ہے۔ یعنی ایک تلوار تو ہاتھ میں ہونا چاہیئے وہ بھی نہیں ہے۔

(۲) اگر ہاتھ میں تلوار بھی نہیں ہے (یعنی کچھ بھی نہیں ہے) تو لڑتے کس طرح ہیں؟

اس کا جواب غالبؔ نے اپنے مصرع اولیٰ میں دے دیا ہے۔ غور کرنے پر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سادگی سے لڑ رہے ہیں اور ایسے لڑ رہے ہیں کہ اس پر جان لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔

(۳) سادگی کس بات میں ہے؟ ساز و سامان سے لیس نہ ہونا سادگی ہے یا معشوق کا یہ اعتماد سادگی ہے کہ بے تیر تلوار مقابل کو مار لیں گے۔؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لڑائی حسن اور عشق کی لڑائی ہے۔دل ہارنے اور جیتنے کی بات ہے اس لڑائی میں سازو سامان یا تلوار کی ضرورت نہیں ہوتی حسن کے مزاج 'سراپا کی' سادگی ہی ایسی جان لیوا ہوتی ہے کہ وہ عاشق کے دل کو ایک جھلک میں جیت لیتی ہے۔لوٹ لیتی ہے۔

(۴) لڑنے سے اگر ہاتھا پائی مراد نہیں تو کیا مراد ہے ؟مد مقابل کون ہے۔؟

یہاں اس بات پر غور کرنا بہت ضروری ہے کہ جس میں سادگی ہوگی وہ ہاتھا پائی کر سکتا ہے یا نہیں ؟ ظاہر ہے کہ جو سادہ مزاج ہوگا اس میں سنجیدگی ہوگی اور ہاتھا پائی کرنا غیر سنجیدہ فعل ہے جو سادہ ہوگا وہ ہاتھا پائی نہیں کر سکتا۔فاروقی صاحب نے سادگی کے دو معنی بیان کئے ہیں۔

(۱) عاری ہونا اور (۲) بھولا پن۔اس میں عاری ہونا درست نہیں ہے۔فیروز اللغات میں دیئے گئے معنی اس طرح ہیں۔بے تکلفی' سادہ روئی' صاف دلی بھولا پن' ناسمجھی' سیدھا پن'

اب شعر کی شرح کچھ اس طرح ہو سکتی ہے۔ حسن اس قدر سادہ ہے کہ اس نے اپنے انداز و ادا کے تیور ذرا بھی نہیں دکھائے اور ہمارا دل لوٹ لیا ہمیں جیت لیا لیکن ہم خود ہی اس کی اس سادگی پر لٹ گئے اسے تو کچھ بھی کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی اس کی ایک جھلک ہی کافی تھی۔اس کی وضاحت کے لئے عبدالحمید عدمؔ کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

کتنے حسین لوگ تھے جو مل کے ایک بار
آنکھوں میں جذب ہوگئے دل میں سما گئے

{۲۶}

ہوئی ہے مانع ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

زیادہ تر شارحین نے اس کی شرح کچھ اس طرح بیان کی ہے۔میں نے سیلاب اشک کے ذریعہ گھر کو تباہ کرنا چاہا تھا تاکہ سیلاب کے باعث دیواروں میں جو رخنے پڑیں ان کے ذریعہ میں اپنی خانہ ویرانی کا تماشہ دیکھ سکوں لیکن کفِ سیلاب نے تمام روزنوں کو بند کر دیا اسلئے ذوق تماشا کی تسکین نہ ہو سکی۔

اسے کہتے ہیں غالبؔ کے مفہوم کو غارت کرنا۔ ہندی میں ایک اچھا سا جملہ ہے
"ارتھ کا انرتھ کرنا" یہاں بھی ارتھ کا انرتھ ہوا ہے۔ بھلا ایسا کون باولا ہوگا جو اپنے بسے بسائے
گھر کو سیلاب اشک سے تباہ کر اپنی ہی خانہ ویرانی کا تماشہ دیکھنا چاہتا ہوگا۔ غالبؔ جیسا ہوش مند
شاعر تو قطعی نہیں چاہے گا بلکہ جو ایسا کرنا چاہتا ہوگا اس پر بھی ہزار مرتبہ لعنت بھیجے گا زرا سوچئے
سیلاب اشک سے روزنوں کا بند ہو جانا۔ تو کیا آنسوں کے ساتھ آنکھوں میں اتنے کیچڑ بھی تھے کہ
ان سے دیواروں کے روزن بند ہو گئے؟ غالبؔ ایسا شعر کہنا تو دور سوچ بھی نہیں سکتے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے تو لفظ کے معنی بھی بدل دیئے ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ
۔"خانہ" بہ معنی "گھر" فرض کرنا ضروری نہیں "خانہ ویرانی" سے خانہ زنجیر یا ہندی خانہ یعنی
زنداں کی ویرانی بھی ہو سکتی ہے۔ بہت خوب جتنی داد دی جائے کم ہے۔ ہمارے حساب سے
خانہ بہ معنی گھر ہی ہے کیونکہ غالبؔ جو لفظ بھی استعمال کرتے ہیں اسے عام معنی میں ہی
استعمال کرتے ہیں یہاں بھی خانہ کا مطلب زنداں قطعی نہیں ہے۔ شرح کے بیان میں ہم یہ
بات اور بھی واضح کر دیں گے۔ اس سے پہلے فاروقی صاحب نے اس شعر کی جو شرح بیان کی
ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیں کہ انہوں نے کیا نکتہ بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

میں ایسے زنداں میں قید ہوں جس میں دریچہ ہے نہ در جس کے روزن بھی نہیں۔ یا
یوں کہئے کہ میں زنداں میں ہوں دروازے کھڑکیاں سب بند ہیں (انہیں کھولا بھی تو جا سکتا ہے
) کوئی روزن بھی نہیں جس سے میں باہر کا نظارہ کر سکوں۔ باہر نکل جانے کی تو بات ہی نہیں
ہو سکتی پھر میں اپنے ذوق تماشہ کو کس طرح تسکین دیتا؟ لہٰذا میں نے سیل اشک بہایا تاکہ
دیواریں گر جائیں یا کم سے کم رخنے تو ان میں پیدا ہو جائیں۔ لیکن میری بد نصیبی دیکھئے کہ وہی
سیلاب جو خانہ ویرانی کا سبب تھا امتناع تماشہ کا سبب بن گیا۔ یعنی دیواروں میں روزن تو سیلاب کی
وجہ سے ضرور پڑے لیکن ان روزنوں میں کفِ سیلاب رک کر تھم گیا اسلیئے باہر کا تماشہ ممکن نہ
ہو سکا۔ سیلاب اشک میں کفِ سیلاب کے کیا معنی؟ آنسوؤں میں دلدل نہیں ہوتی۔ خیر۔

شعر میں کیسی زنداں کی بات نہیں ہے مضمون ایک گھر ہی کا ہے سیلاب اشک بھی

اس میں کہیں نہیں ہے بلکہ اصل سیلاب کا منظر ہے۔ شرح ملاحظہ ہو۔

ایک زمانہ تھا کہ میرا یہ گھر آباد تھا اس میں درودیوار ہی نہیں روزن بھی تھے۔ میں جب ان روزنوں سے باہر کی دنیا کا تماشہ دیکھتا تھا تو بہت ہی خوبصورت لگتا تھا جو بات کھڑکی دروازوں سے دیکھنے میں نہیں ہوتی وہ روزن سے جھانکنے میں ہوتی ہے۔ پھر ایک زبردست سیلاب آیا اور میرے گھر کو تباہ و برباد کر گیا۔ وہ تمام روزن بھی سیلاب کی دلدل سے بند ہو گئے۔ میرے گھر کی تباہی میں وہ روزن کیا بند ہوئے کہ میں باہر کی دنیا کا ایک خاص انداز سے نظارہ کرنے سے محروم ہو گیا۔ روزن سے جھانکنے کا یہ مضمون ویسا ہی ہے جیسا کہ آگرہ کے لال قلعہ کے ایک روزن سے شاہ جہاں تاج محل کو دیکھا کرتا تھا اور لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہی لطف اس شعر میں بھی ہے۔

{۲۷}

رنگِ شکستہ صبحِ بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گل ہائے ناز کا

فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ اس شعر میں دو ابہام ہیں۔ اوّل تو یہ کہ کس کا رنگ شکستہ ہے؟ اور دوئم یہ کہ "صبح بہار نظارہ" سے کیا مراد ہے۔؟ مولانا حسرت موہانی نے بہار نظارہ کو وصل کے معنی میں لیکر ایک نیا پہلو پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن صحیح بات تو یہ ہے کہ تمام شارحین "رنگ شکستہ" میں اس طرح الجھے کہ انہوں نے جو بھی شرح اس شعر کی لکھنی چاہی اس کا رنگ جما نہیں اڑتا ہی چلا گیا۔

خود فاروقی صاحب نے اس شعر کی شرح یوں بیان کی ہے اگر "رنگ شکستہ" سے معشوق کے چہرے کا رنگ اڑنا مراد لیں تو سب مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ معشوق کا رنگ شکستہ اسلئے ہے کہ وہ خود کسی پر عاشق ہو گیا ہے۔ عشق کے آزار میں مبتلا ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب وہ اپنے معشوق سے ملنے کے لئے باہر آئے گا یا بے پردہ ہو گا۔ اس طرح عشاق کے لئے بہارِ نظارہ کی صبح ہو جائے گی اور چونکہ اب خود اس کا دل دردمند ہے اس لئے وہ

اپنے عاشقوں کے لئے گل ہائے ناز کو شگفتہ کرے گا یعنی انہیں اپنے ناز و انداز بخوبی دکھائے گا ۔مثال کے لئے غالبؔ کا ایک شعر بھی فاروقی نے پیش کر دیا ہے۔

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے

دراصل "رنگ شکستہ" کی تہ تک فاروقی صاحب کا ذہن بھی نہیں پہنچ پایا ہے رنگ شکستہ کے معنی اس شعر میں رنگ اڑنے سے بالکل نہیں ہے۔بلکہ یہ وہ رنگ ہے جس میں معشوق کی شکست موجود ہے۔وہ اپنے عاشق کو ستانے یا تڑپانے میں پوری طرح ناکام ہو چکا ہے اس کا عاشق اس سے بے نیاز ہے اور یہی بے نیازی معشوق کی شکست کا سبب بن گئی ہے اب وہ صبح بہار کی طرح اپنا نظارہ دکھانے کے لئے بیتاب ہو گا اور یہی وقت گل ہائے ناز کے شگفتہ ہونے کا وقت ہے۔ معشوق اپنے عاشق کو رجھانے کے لئے گل ہائے ناز کھلائے گا اور اس کا دل جیتنے کی کوشش کرے گا۔

اس شعر میں غالبؔ نے محبوب کی شکست کو بھی صبح بہار کا نظارہ قرار دے کر شعر میں معنویت پیدا کر دی ہے یہ کمال کوئی اعلیٰ دماغ ہی پیدا کر سکتا ہے۔ایک خاص غور طلب بات یہ بھی ہے کہ شکست علامت ہے ٹکڑوں میں لیٹنے کی اور پھول جب کھلتا ہے تو اس کی پتیاں بھی الگ الگ بکھری ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔شکست سے گل ہائے ناز کی شگفتگی کی تمثیل اس شعر میں بے مثل ہے جس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔

اب اگر دوسرے پہلو سے اس شعر کو دیکھیں تو یہ معنی بھی بر آمد ہو سکتے ہیں کہ۔ آج کی صبح نے جو رنگ بکھیرا ہے وہ بہار کا نظارہ ہے (ذرا غور کریں "رنگِ شکستہ صبح" پر یہاں شکستہ بہ معنی بکھیرنے کے ہیں) اب پھولوں کے کھلنے کا زمانہ آگیا ہے۔"رنگِ شکستہ" کے معنی رنگ بکھیرنے سے بھی اسلئے جا سکتے ہیں کہ شکست کے معنی ٹوٹنا بکھرنا ہے۔اور رنگِ شکستہ صبح" یعنی۔رنگ بکھیرنے والی صبح۔ ظاہر ہوا کہ رنگِ شکستہ کے معنی اس شعر میں رنگ اڑنے سے قطعی نہیں ہیں ۔غالبؔ کے اس شعر کو اگر چار ٹکڑوں میں بانٹ کر پڑھا جائے تو اور زیادہ صاف ہو جاتا ہے۔

رنگِ شکستہ صبح ، بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ ، گل ہائے ناز کا

{۲۸}

بجز پرواز شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

شعر بہت صاف ہے لیکن محترم شمس الرحمٰن فاروقی کی تشریح اتنی صاف نہیں جتنی ہونا چاہیے۔انھوں نے اس شعر کے دو مفہوم بیان کئے ہیں۔ایک یہ ہے کہ عشاق جل کر یا آوارہ گردی کے باعث خاک ہو چکے ہیں ہوائے تند چلی تو اس خاک کو اڑا لے گئی یعنی اس خاک پر قیامت کا انتشار برپا کر گئی۔اس خاک میں شوق پرواز کے سوا باقی ہی کیا رہا ہوگا؟

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شعر میں ذکر شہیدوں کا آیا ہے عشاق کا نہیں نہ ہی ان کے جلنے یا آوارہ گردی کرنے کی ہی بات کہی گئی ہے۔ پھر جب تند ہوا چلی تو خاک کو اڑا لے گئی تو پھر شوق پرواز کے لئے مزید خاک کہاں سے آگئی؟

دوسرا مفہوم فاروقی نے یہ بیان کیا ہے کہ خاک تو ذرہ ذرہ ہو کر غبار کی شکل میں ہوائے تند کے باعث اڑ گئی اب وہاں شوق ناز کی پرواز کے سوا کیا بچا ہوگا؟ پہلے تو خاک بھی تھی لیکن اب خاک کو ہوا نے تتر بتر کر دیا۔وہاں اب شہیدوں کی نشانی صرف پرواز شوق ناز ہے جو غیر مرئی شئے ہے۔

لیکن غالبؔ نے کسی غیر مرئی شئے کا ذکر نہیں کیا ہے وہ تو صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیدا ں پر یعنی خاک شہیداں وہاں موجود ہے جس پر ہوائے تند چلنے سے قیامت گزر جاتی ہے۔ شعر کی صحیح تشریح کچھ اس طرح ہونا چاہیئے کہ شہیدوں کے مٹ جانے کے بعد ان کی قبر پر اب خاک رہ گئی ہے۔اس خاک کے ذروں میں سوائے پرواز شوق ناز کے کچھ اور باقی نہیں ہے جب کبھی تند ہوا کے جھونکے ان قبروں سے ہو کر گذرتے ہیں تو اس خاک پر ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے۔کیونکہ پرواز شوق کی وجہ سے یہ ذرے ہوا کے ساتھ ازان بھرتے اور نہ جانے کہاں کہاں بکھر جاتے ہیں کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جیتے جی تو شہیدوں پر شوق پرواز کی وجہ سے قیامت برپا ہوتی ہی رہی

ہے اب مرنے کے بعد ان کا یہ شوق ان کی خاک پر بھی قیامت برپا کرنے کا سبب بنا ہوا ہے۔

{۲۹}

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

شعر بالکل سادہ اور صاف ہے لیکن کچھ باتیں اس کے تعلق سے جواب تک نہیں کہیں ہیں ان کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ پہلے اس کی تشریح جو فاروقی صاحب نے بیان کی ہے وہ ملاحظہ ہو۔ میرے بال و پر میں طاقت تو ہے نہیں اب یہی ممکن ہے کہ جب میں غبار بن جاؤں تو ہوا مجھے اڑا لے جائے۔ تمنائے پرواز کی تکمیل بس اسی طرح ممکن ہے کہ میں مر کر خاک ہو جاؤں اور ہوا مجھے اڑا دے شعر کی تشریح درست ہے۔ ایک اور تشریح بھی فاروقی صاحب نے اس کی کی ہے کم و بیش اس کا مفہوم بھی یہی ہے۔ میں اس شعر کے تعلق سے کچھ فنّی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

شعر کا اولیٰ مصرع مگر سے شروع ہوا ہے جو غیر فصیح تو ہے ہی بے معنی بھی ہے۔ اسے کسی اور ڈھنگ سے بھی کہا جا سکتا تھا۔ مثلاً

(۱) کہ بس غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے

(۲) مجھے غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے

(۳) عبث غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے

(۴) کہ پھر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے

(۵) کبھی غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے

پر کسی اور انداز سے بھی یہ مصرع غالبؔ کو کہنا چاہیئے تھا۔ کیونکہ مصرع ثانی کی ابتداء پھر "وگرنہ" سے ہوئی ہے "مگر" اور "وگرنہ" ایک ہی شعر میں کچھ اچھے معلوم نہیں دے رہے ہیں۔ اسے نظر انداز کر آگے بڑھتے ہیں تو پتہ یہ چلتا ہے کہ شعر میں ایک زبردست خوبی بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مصرع اولیٰ میں غالبؔ نے غبار ہوئے پر ہوا کے اڑا

لے جانے کی بات کہی ہے وہیں مصرع ثانی میں بال و پر میں خاک نہیں کہہ کر غبار اور خاک کا جو رشتہ قائم کیا ہے اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے یہ غالبؔ کی ذہانت کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ غبار ہوئے پر ہوا اڑا کر لے جانے والی ہے اسلئے خاک ہونا ضروری ہے فی الحال تو حالت یہ ہے کہ بال و پر میں خاک نہیں ہے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ فاروقی صاحب کی پارکھی نظر سے یہ دونوں نکتے او جھل کیسے رہ گئے؟

{۳۰}

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں

غالب کے اس شعر نے شارحین کو خاصا پریشان کیا ہے۔ سب ہی کو غالبؔ کے پاؤں دابنے کی زحمت اٹھانا پڑی ہے۔ نظم طباطبائی نے کہا کہ اگر اسے استعاراتی شعر کہا جائے تو بھی نہ معنی حقیقی ظاہر ہوتے ہیں اور نہ استعارے واضح ہیں۔ بے خود موہانی کی نظر میں معشوق کا رہزن سے استعارا تو ایسا صاف ہے جیسے چمکتا سورج۔ یوسف سلیم چشتی کے مطابق یہ شعر قافیہ پیمائی کے سوا کوئی معنوی خوبی نہیں رکھتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کئی مشکل ز ں میں غالبؔ نے قافیہ پیمائی کا ہنر دکھایا ہے زیر بحث شعر میں بھی پاؤں کی ردیف کو خوبصورتی کے ساتھ نباہتے ہوئے اچھا مضمون باندھنے کی کوشش کی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر کی شرح یوں بیان کی ہے۔ پہلے مصرعے میں بہت بھاگنے کا ذکر ہے یعنی متکلم کو اپنی تیز رفتاری پر بہت ناز تھا وہ بہت آزاد رو اور وارستہ مزاج تھا اسے گرفتاری پسند نہیں تھی۔ تیز رفتاری اور آوارگی نے اس کے پاؤں تھکا دیئے۔ گرفتار ہو جانے کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ تھکے ہوئے پاؤں کو آرام پہنچانے کی کوئی سبیل کی جاتی لیکن متکلم کو گرفتار کرنے والے کے پاؤں دبانے کی سزا بھگتنا پڑی۔ اس طرح یہ شعر ایک مکمل استعارا ہے۔ میں اس شعر کی بہت ہی سادگی کے ساتھ شرح بیان کرنا چاہتا ہوں جو اس طرح ہے۔

راہزن جب ہمیں پکڑنے کے لئے ہمارے پیچھے بھاگنے لگا تو ہم بہت دوڑے تھے ۔راہزن کو ہم سے بھی زیادہ دوڑ لگانا پڑی تھی۔اب راہزن اس قدر تھک گیا ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد ہمیں اس کے پاؤں دابنا پڑرہے ہیں۔یہ سزا اسی کی ہے کہ ہم نے راہزن کو کافی پریشان کیا تھا اور بڑی دیر تک اس کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔اسے تھکا دیا تھا۔یعنی ہم اگر کسی کو پریشان نہیں کرتے تو یہ پریشانی ہمارے گلے نہ پڑتی۔غالب کے اس شعر میں قافیہ پیمائی ہی نہیں مضمون بندی بھی موجود ہے۔اور یہی مضمون بندی کا ہنر صرف قافیہ پیمائی کرنے والے شاعروں سے غالبؔ کی روش پر چلنے والے کسی بھی شاعروں کو ایک خاص درجہ عطا کرتا ہے۔

{۳۱}

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیوں کر ہو

مطلع پر اگر غور کیا جائے تو پہلی ہی نظر میں ایک بات یہ سامنے آتی ہے کہ غالبؔ نے "گفتگو" کے ساتھ "کہو" کا قافیہ باندھا ہے۔اسی غزل میں آگے چل کر "وہ" کا قافیہ بھی ہے۔یہ غالبؔ پر فارسی کے اثر کی وجہ سے ہے۔آج کا شاعر اگر اس طرح قافیہ استعمال کرے تو ناقد پہلی فرصت میں اس کی علمیت پر شک کرنے سے نہیں چوکیں گے ۔غالبؔ کی اس قافیہ پیمائی پر کسی بھی شرح نگار نے کوئی خلا پیش نہیں کیا ہے۔؟

محترم فاروقی صاحب نے اس شعر کی شرح بڑی ہی سادگی سے پیش کی ہے۔مفہوم یہ ہے کہ کہنا اور چیز ہے گفتگو اور چیز ہم نے کہہ تو لیا لیکن گفتگو نہ ہوئی۔پہلے مصرع میں گفتگو کا ذکر ہے اور دوسرے مصرع میں کہنے کا۔لہٰذا معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کہا تو ضرور لیکن گفتگو نہ ہوئی یعنی اس نے کچھ سوال جواب نہ کیا۔اب دوبارہ کہیں بھی تو کیا پتہ اس بار بھی کچھ کرنے یا ہونے کا احساس ہو کہ نہ ہو؟

ہم تھوڑا سا خلا اور کرنا چاہیں گے تاکہ شعر کو سمجھنے میں تھوڑی آسانی ہو سکے۔شاعر کہہ رہا ہے کہ وہ دن گذر گئے جب ان سے گفتگو بھی ہوتی تھی ہم اپنے دل کا حال سنا دیتے تھے لیکن اب

ایسا نہیں ہے اب تو ان سے گفتگو کرنے کا بھی کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے۔اس کے باوجود بھی میں نے اپنے دل کا حال کسی بہانے سے کہا جس کا اثر بھی کچھ نہ ہو سکا اب دوبارہ کچھ کہنے سے کیا حاصل۔ ؟

فاروقی نے لکھا ہے کہ اس قدر تازہ اور پیچیدہ شعر غالبؔ یا پھر میرؔ کے ہی بس کا تھا اور معاملہ بندی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو مومن بھی مات ہوتے ہیں۔ لیکن اصلیت یہ ہے کہ ثانی مصرعے میں غالبؔ ردیف چسپاں ہی نہیں کر پائے ہیں پوری ردیف بھرتی کی لگتی ہے۔

{۳۲}

تمہیں کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیوں کر ہو

اس شعر کی شرح بے خود موہانی، شمس الرحمٰن فاروقی اور نیر مسعود آدھی ادھوری ہی کی ہے ۔دراصل سب ہی صنم پرستوں اور بتوں کے معنی ڈھونڈتے ہی رہ گئے ہیں ۔غالب کی ذہانت ہمیشہ اس بات کی قائل رہی ہے کہ جہاں کہیں بھی ایک ہی معنی کے دو لفظ اس نے استعمال کیے ہیں۔اس شعر میں بھی بت اور صنم کو اسنے "صنم" کے معنی محبوب سے لئے ہیں جبکہ مصرع ثانی میں بت کے معنی پتھر کی مورت کے ہیں

اب اگر اس شعر کی شرح پر غور کریں تو مفہوم یہ برآمد ہوتا ہے کہ متکلم اپنے مفہوم سے سوال کر رہا ہے کہ اے میرے محبوب تم ہی بتاؤ کہ اپنے محبوب کے چاہنے والوں کو گذارا اس حالت میں کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ تم نے بتوں کی خو اپنالی ہے تم نے پتھر کی مورت کی طرح خاموشی اختیار کر لی ہے۔ تم پر ان کے رنج و غم آہ و زاری کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے۔ عشق کا مزہ تو تب ہی آتا ہے جب دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی عاشق کی تڑپ کا اثر معشوق پر ہونا لازمی ہے ورنہ اپنے محبوب کے چاہنے والوں کا گذارا اس دنیا میں مشکل ہو جائے گا۔

{۳۴}

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

میرے خیال سے غالبؔ کے اشعار کی جتنی بھی شرحیں لکھی جائیں کم ہیں۔اس کا سادہ سے سادہ شعر بھی کئی معنی لئے ہوئے نظر آتا ہے۔جس پہلو سے بھی دیکھئے کوئی نہ کوئی مفہوم آواز دیتا دکھائی دیتا ہے۔زیر بحث شعر کی تشریح محترم فاروقی نے بہت عمدہ کی ہے لیکن اس کے بعد بھی ایک پہلو میرے ذہن میں اور نکل آیا ہے۔وہ بعد میں بیان کروں گا پہلے فاروقی کی شرح دیکھ لیتے ہیں۔

مفہوم یہ نکلا کہ ہمیں ایک بار مایوسی ہوئی تھی لیکن اب پھر ہم امیدوار ہورہے ہیں'اور وہاں عالم یہ ہے کہ وہ ہماری بات ہی نہیں پوچھتے ایسی صورت میں انہیں ہماری قدر ہو تو کیونکر ہو۔؟

غالب کے اکثر اشعار میں ہمنے یہ خاص بات دیکھی ہے کہ جو بات انہیں مصرع اولی میں کہنا چاہئے تھی وہ ثانی مصرعے میں میں کہتے ہیں دوسرے مصرعے تک وہ شعر کے مفہوم کو راز میں رکھتے ہوئے اپنی بات وہ سیدھے سپاٹ انداز میں کبھی نہیں کہتے کوئی نہ کوئی پیچ اس میں ضرور ڈال دیتے ہیں۔زیر بحث شعر میں بھی ایسا ہی ایک پیچ غالبؔ نے ڈال دیا ہے مفہوم کی گرہ ثانی مصرع سے کھلتی ہے شرح ملاحظہ کیجئے۔

مفہوم یہ ہوا کہ اگر وہ ہماری بات ہی نہیں پوچھ رہے ہیں تو ایسی حالت میں نہ تو ہمیں ان سے کوئی امید ہی ہوسکتی ہے نہ وہ ہماری کوئی قدر کریں گے اس کا بھروسہ تو تب ہی ہمارے دل کو ہوسکتا تھا کہ وہ ہمیں پوچھتے۔اب جبکہ انہوں نے ہماری بات ہی نہ پوچھی تو ان سے کوئی امید کرنا قدر افزائی کے بارے میں سوچنا بے معنی ہے۔

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

شعر بالکل سادہ معلوم دیتا ہے لیکن محترم فاروقی صاحب نے لکھا ہے کہ اس کے معنی بیان کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس شعر کی شرح میں ہر شرح نگار الجھ کر رہ گیا ہے۔ ان سب کو یہاں پیش کرنا وقت برباد کرنا ہے۔ جو شرح فاروقی نے بیان کی ہے وہ اس طرح ہے ملاحظہ ہو۔

پہلا دل معشوق کا دل ہے اور پہلے مصرعے کی ضمیر (ہم) عاشق کی طرف واضح ہوتی ہے دوسرا دل عاشق کا دل ہے اب مفہوم یہ ہنا کہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم تمہارے دل میں نہیں ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ جب ہمارے دل میں تم ہی تم ہو تو ہماری آنکھ سے نہاں کیوں ہو؟ آگے انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے دل کو معشوق کا دل اور دوسرے دل کو عاشق کا دل فرض کرنے کا شعر میں کوئی جواز نہیں ہے اس لئے شرح ناقص ٹھہرتی ہے۔ لیکن دیگر شروح سے انہوں نے اپنی شرح کو بہتر بتایا ہے۔

یہاں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ غالبؔ اپنی ہر بات جواز شعر میں پیش کر دیتا ہے۔ یہاں دل عاشق کا ہی ہے معشوق کے دل کا تصور کرنا خواہ مخواہ بے معنی ہے۔ ہمارے حساب سے شعر کا مفہوم بیان کرن ٹیڑھی کھیر نہیں ہے کہ اس کا مفہوم صاف ہے۔

عاشق اپنے محبوب سے کہہ رہا ہے کہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم تمہارے دل میں نہیں ہیں (یعنی معشوق عاشق کے دل میں نہیں ہے) لیکن جب ہمارے دل میں تم ہی تم موجود ہو تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتے ہو؟ تمہیں تو ہر دم نگاہوں کے سامنے رہنا چاہئے کیونکہ ہم نے تمہیں اپنے دل میں بسالیا ہے اپنے دل میں قید کر لیا ہے۔ اب ہم سے دور دور رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس شرح کو ناقص نہیں کہا جا سکتا ہے بلکہ اصل اور مکمل شرح یہی ہے۔

{۳۵}

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لیئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

شارحین نے فرض کیا ہے کہ ''آزمانا'' اور ''عدو کا ہو جانا'' دو الگ الگ چیزیں ہیں ۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابتدا ہی بہکنے سے ہوئی ہے تو آگے کیا گل کھلائیں گے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے جبکہ غالبؔ نے صاف کہا ہے کہ ''یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں '' اگر اس شعر میں دو الگ الگ چیزیں کوئی ہیں تو وہ ہیں ''آزمانا'' اور ''ستانا''

فاروقی صاحب نے اس کی شرح کچھ یوں بیان کی ہے ۔جب معشوق نے دشمن سے لو لگائی تو عاشق نے شکوہ کیا۔ معشوق نے جواب دیا کہ ہم نے تو تمہاری استقامت اور پائداری کا امتحان لینے کے لئے دشمن سے دوستی کی ہے اس کے جواب میں عاشق کہتا ہے کہ اگر تم دشمن سے دل لگانے کو ہماری آزمائش کہتے ہو تو پھر ستم کس چیز کا نام ہے ؟جب تم دشمن کے ہو ہی گئے تو ہمارا امتحان لے کر کیا کرو گے ؟

فاروقی نے شعر میں عاشق و معشوق کے سوال جواب پیدا کر دیئے ہیں جبکہ ایسا ہے نہیں معشوق کا کوئی جواب شعر میں نہیں ہے صرف عاشق ہی معشوق پر دندناتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ ہمارے حساب سے شعر کی شرح ملاحظہ ہو۔

یہ کیسا آزمانا ہے ؟ تم مجھے آزما نہیں رہے ہو۔ ستا رہے ہو آزمانے اور ستانے میں بڑا فرق ہے۔ اگر مجھے آزمانا ہی تھا تو کوئی اور صورت نکالی ہوتی لیکن تم تو دشمن کے ہو گئے اگر تمہیں دشمن ہی کا ہونا تھا تو میرا امتحان لینا کیا معنی ؟ میں کسی امتحان سے نہیں گزرنا چاہتا کیونکہ تم دشمن کے ہو ہی گئے ہو تو میرا تم سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ غالبؔ کے تیور اس شعر میں بھی موجود ہیں جب تک انہیں نہ سمجھ لیا جائے مفہوم کی تہہ تک پہنچنا ممکن ہے۔

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

اس شعر میں تکلف نے شرح لکھنے والوں کو خا تکلیف میں ڈالا ہے۔ سب ہی نے تکلف کے معنی بناوٹ لئے ہیں۔ جو یہاں ٹھیک نہیں ہے۔ تکلف کے معنی جھجھک یا ہچکچاہٹ بھی ہیں اور اس شعر کے مفہوم کے لئے وہی صحیح ہے۔ اس سے پہلے کہ اس شعر کی شرح بیان کی جائے متداول شرح پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ ملاحظہ ہو۔

ہم کچھ دن تک معشوق سے آزردگی کا اظہار کرتے رہے لیکن آزردگی محض بناوٹ پر منبی تھی صاف صاف پوچھئے تو یہ آزردگی بھی ہمارے جنون کا ہی یک انداز تھی ۔فاروقی لکھتے ہیں کہ یہ تشریح بالکل درست ہے۔ ہماری اپنی رائے یہ ہے کہ یہ تشریح بالکل غلط ہے۔ کیونکہ شعر میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ آزردگی بھی جنون کا ایک انداز تھی ۔غالب نے صاف طور پر کہا ہے کہ تکلف بر طرف بھی ایک اندازِ جنون تھا۔ پھر آزردگی میں بناوٹ کی ملاوٹ بھی گلے نہیں اترتی ہے۔

فاروقی نے اس شعر کے تعلق سے لکھا ہے کہ چوبیس برس کی عمر میں کیا گیا یہ شعر غالب کا ایک کارنامہ ہے اور اس کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ اگر شاعری کوئی دین ہوتی تو میرا دیوان اس دین کا آئین ہوتا۔ خیر دیکھیں ذرا کہ فاروقی صاحب نے اس شعر کی شرح کیا لکھی ہے۔

یہ ترکیب کہ ہم کچھ دیر کے لئے جھوٹ موٹ آزردہ بن جائیں ہمیں جنون ہی نے سکھائی تھی ہم ہوش وحواس میں ہوتے تو اتنی بڑی حرکت نہ کرسکتے تھے معشوق ہم کو حقیر اور کم حقیقت جان کر ہمارا مذاق اڑاتا تھا۔ ہم سے اس طرح کا برتاؤ کرتا تھا کہ صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ ہم کو ذلیل کرنا بھی پسند نہیں کرتا بلکہ طنز ومزاح کا ہدف سمجھتا ہے اس

کی یہ شوخی ہم پر شاق گذرتی تھی۔ ہمارے جنون نے ہم کو سکھایا کہ میں تم خود کو اس طرح خوار وزار کرتے ہو۔ معشوق سے آزردہ ہو جاو چنانچہ ہم نے ویسا ہی کیا لیکن چند دنوں میں معلوم ہو گیا کہ معشوق کے یہاں آنا جانا ترک کرنے میں زیادہ برائی ہے اس سے بہتر یہی ہے کہ پھر اس کی بارگاہ میں حاضری دینا شروع کر دو لہذا ہم نے ایسا ہی کیا۔

طویل کہانی گھڑنے کے باوجود مفہوم برامد نہ ہو سکا۔ یہ شعر اس قدر ڈال ڈال پات پات گھومنے والا بھی نہیں ہے۔

دراصل یہ شعر محبت کے ابتدائی دور کا منظر نامہ ہے۔ یہ وہ دور ہوتا ہے جب عاشق اپنے دل کا حال معشوق سے کہنے میں تکلف برتا ہے۔ جھجھک محسوس کرتا ہے۔ متکلم کہہ رہا ہے کہ ہم اس شوق سے یعنی اپنے محبوب سے کچھ دنوں سے ناخوش اسلئے تھے کہ ہم اپنے دل کی بات کہنے میں اس کے سامنے جھجھک محسوس کرتے تھے اور اس جھجھک کا ٹنا ہمارے لئے ایک انداز جنوں تھا یعنی یہ جھجھک یہ ہچکچاہٹ مٹانے کے لئے بھی ہمیں جنون کی حدوں سے گذرنا پڑتا ہے تب جا کر اپنے اپنے محبوب سے ہم بے تکلف ہو سکے ہیں۔

اس شعر کے ذریعہ ہمیں اس بات کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ غالبؔ جس لفظ کو بھی برتا ہے اسے گنجینۂ معنی کے طلسم سے ایسا آبدار بناتا ہے کہ اس پر ہرایرے غیرے کی نظر ٹھہر نہیں پاتی ہے۔ اس لئے غالبؔ کے اشعار میں جو بھی نقطہ آتا ہے شرح لکھتے وقت اسکے صحیح معنی پر غور کرنا بھی لازمی ہو جاتا ہے ورنہ اکثر نظر دھوکہ کھا جاتی ہے۔ اور صحیح مفہوم برامد نہیں ہوتا ہے۔

{۴۷}

خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

اس شعر کی تعریف میں محترم فاروقی نے لکھا ہے کہ ایسے ہی شعروں کی بنا پر

غالبؔ کا پلہ میرؔ سے بھاری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایک وضاحت میں یہ کر دینا چاہتا ہوں کہ کئی مقامات ایسے ہیں جہاں غالبؔ، میرؔ سے بڑا شاعر معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے برعکس کئی ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں میرؔ، غالبؔ سے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ اور ان دونوں سے اگر اردو کا کوئی شاعر بازی مار لے جاتا ہے تو وہ ہے میر ببر علی انیسؔ جس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

زیرِ بحث شعر میں بھی شرح لکھنے والوں نے دور کی کوڑی لانے کی کوشش میں پاس کے مفہوم کو نظر انداز کر دیا ہے حسرت موہانی نے لکھا ہے کہ دام دام تمنا میں بہت سی آرزوئیں ہیں بعض ایسی ہیں جو تمنائے مرگ سے بھی بڑھ کر ہیں۔ بس ظاہر ہے کہ خیال مرگ سے دل آزردہ کو کیا تسکین ہو سکتی ہے!

بے خود موہانی نے کہا ہے کہ بجھے ہوئے دل کا علاج ہے موت۔ صرف آرزوئے موت اسے تسکین نہیں دے سکتی۔

فاروقی صاحب نے بھی اپنے انداز سے شرح کا بیان یوں کیا ہے۔ دل میں ہزاروں آرزوئیں ایک عرصے سے گھٹ رہی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بالکل نحیف و نزار ہو گئی ہیں۔ یا وہ آرزوئیں اتنی قوت مند نہ تھیں کہ مقصد بر آری کر سکتیں۔ موت کی امید بھی ان میں سے ایک ہے ایسی نحیف آرزو سے دل کو کیا تسکین ہو۔ میرے دل نے تمنا کا جال پھیلایا بہت سی آرزوئیں اس میں گرفتار آئیں لیکن وہ صیدِ زبوں کی طرح ہیں۔ جس طرح لاغر جانور دام سے نہیں نکل سکتا اسی طرح یہ آرزوئیں بھی اس قدر نحیف و نزار ہو چکی ہیں کہ جال سے نکل نہیں سکتیں۔ خیال مرگ جیسی ہزاروں آرزوئیں دام تمنا میں ہیں اسلئے موت کی امید یا آرزو سے کیا تسکین ہو؟ یعنی اس بات سے کیا تسکین ہو کہ موت آئے گی؟ میری تو کوئی آرزو نہیں نکل رہی ہے کیا امید ہے کہ موت کی آرزو پوری ہو گئی۔ خاص کر جب وہ صیدِ زبوں کی طرح ہے یعنی اتنا لاغر جانور کہ جال سے نکل نہ سکے۔؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دل میں ہزاروں خواہشوں کا کوئی ذکر اس شعر میں نہیں ہے ۔جب وہ آرزوئیں ہیں ہی نہیں تو ان کی نحیف اور لاغر ہونے کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا یہ سب خواہ مخواہ کی دماغی اپج ہے۔ غالب نے تو صرف ایک خیال مرگ کا ذکر کیا ہے۔ اور اپنے آزردہ ہونے کی بات کہی

ہے۔ لیکن ہمارے ناقد زبردستی غالبؔ سے پتہ نہیں کیا کیا کہلوانا چاہتے ہیں۔ حالت ایسی ہو گئی ہے بیچارے غالبؔ کی کہ مار مار کر مسلمان بنایا جارہا ہے۔ لیکن ہم وہی کہیں گے جو کچھ شعر میں غالبؔ نے کہا ہے۔

زیرِ بحث شعر میں غالب نے کہا ہے کہ مجھ جیسے ناخوش، ناامید، مایوس انسان کے لئے تو اب ایک خیالِ مرگ ہی باقی رہ گیا۔ بھلا یہ میرے دل کے لیے تسکین کا سبب کیا بنے گا۔ یعنی خیال مرگ تو انسان کے دل کو اور بجھا دیتا ہے۔ وہ سکون نہیں بخشے گا۔ یہ تو ہوا مصرع اولیٰ کا خیال۔

مصرع ثانی میں غالبؔ نے کہا ہے کہ میری تمنا کے جال میں خیال مرگ اسی طرح موجود ہے جیسے کوئی لاغر جانور جال میں پھنسا ہوتا ہے۔ خیال مرگ کو صید زبوں کہہ کر غالبؔ نے جو معنویت پیدا کی ہے وہ بے مثال ہے لیکن اس معنویت کو سمجھنے کے لئے بھی غالبؔ جیسے اعلیٰ دماغ کی ضرورت ہے۔ ایسے شعر کو سمجھے بغیر غالبؔ کو میرؔ سے بڑا شاعر ثابت کرنا بے معنی ہے۔ پہلے غالبؔ کو صحیح طور پر سمجھ تولیں پھر کوئی دعوی کریں تو بات کہنے والے کا پلہ بھاری ہوگا۔

{۳۸}

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

غالبؔ کی غزل کے اس مطلع میں ایطا ہے۔ اس فنی نقص کی طرف کسی بھی شرح نگار کی نظر نہیں گئی ہے خود شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اس طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے؟ یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دینا ضروری ہے کہ غالبؔ کے کچھ اور مطلعوں میں بھی ایطا ہے لیکن اس فنی عیب کو غالبؔ نے شاید کبھی عیب سمجھا ہی نہیں۔

جہاں تک شرح کی بات ہے یہ شعر کسی کے پلے نہیں پڑا ہے خود شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کی شرح عجیب و غریب انداز سے لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

بزم بتاں میں پہنچ کر حرف و سخن کا دماغ آسمان پر پہنچ جاتا ہے۔ معشوق تو یونہی آزردہ

رہتے ہیں یعنی زیادہ توجہ نہیں دیتے اب سخن بھی آزردہ ہو جاتا ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ کچھ بولیں لیکن منھ سے بولی نہیں نکلتی گم سم بیٹھے رہتے ہیں۔اس کے آگے بہت بے سر پیر کی باتیں ہیں جن کا اس شعر کے مفہوم سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔اسلئے میں انہیں یہاں نقل نہیں کر رہا ہوں۔

شعر میں نہ تو سخن کا دماغ آسمان پر پہنچنے کی بات کہی گئی ہے نہ ہی معشوق کے آزردہ ہونے کا ذکر ہے نہ ہی گم سم بیٹھنے کی طرف ہی کوئی اشارہ کیا گیا ہے پھر مجھے یہ شعر اتنا پیچیدہ بھی نظر نہیں آتا کہ فاروقی جیسا عالم اور دانشور اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔لیکن حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو کچھ معنی انہوں نے شعر کے بیان کئے ہیں وہ بے معنی ہیں۔

مصرع اولیٰ زرا غور سے پڑھیں تو غالبؔ نے کہا ہے کہ بزم بتاں میں جس کسی کو بھی دیکھئے وہ آزردہ لبوں سے بات کرتا دکھائی دیتا ہے اور یہ اسلئے ہے کہ ہر کوئی معشوق کی خوشامد ہی میں لگا ہوا ہے۔ایک ہم ہیں جو معشوق کی خوشامد نہیں کرتے اپنی انا اور خودداری کو بر قرار رکھتے ہیں لیکن ہم ان خوشامد کرنے والوں سے تنگ آچکے ہیں۔ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ خوشامد طلب محبوب سے ہم تنگ آچکے ہیں۔

اس شعر میں غالبؔ نے پھر اپنے خاص انداز میں "آزردہ لبوں" اور خوشامد طلبوں میں جو ربطہ پیدا کیا ہے، جو مثال دی ہے وہ بے مثال ہے۔خوشامد طلب اکثر آزردہ لبوں ہی سے تو باتیں کرتے ہیں۔اس ہنر میں غالبؔ کو اردو کا کوئی دوسرا شاعر نہیں چھو سکتا۔

{۳۹}

کس پردے میں ہے آئینہ پرداز اے خدا

رحمت کہ عذر خواہ لبِ بے سوال ہے

محترم فاروقی صاحب نے اس شعر کے تعلق سے لکھا ہے کہ کئی ہفتوں کے غور وفکر کے بعد میں مجبوراً اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ شعر تعبیر و تشریح کا متحمل نہیں ہو سکتا وہ

یہ بھی کہتے ہیں کہ غالبؔ جو بات کہنا چاہتے تھے وہ ادا نہ ہو سکی کیونکہ ان کی سمجھ میں یہ نہ آسکا کہ غالبؔ کہنا کیا چاہتے تھے۔اس کے باوجود انھوں نے اس شعر کے الگ الگ تین مفہوم نکالے ہیں ان میں سے ایک غنیمت ہے جو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔اے خدا تو کس پردے میں آئینہ پرداز ہے؟ رحمت کر کہ سب بے سوال عذر خواہ ہے۔اس شرح سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ غالبؔ نے کہا ہے یا کہنا چاہتے تھے وہ مفہوم فاروقی کی سمجھ میں آچکا ہے۔ویسے بھی شعر میں کوئی پیچ نہیں ہے سیدھا اور صاف مضمون ہے۔اب کوئی جان بوجھ کر اس میں الجھنا چاہے تو ظاہر ہے کہ ایسے میں الجھن تو بڑھتی ہی جائے گی۔

میں اس مضمون کے مفہوم کو ذرا اور واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ متکلم کہہ رہا ہے کہ اے خدا اب تک تو میرے لب بے سوال رہے کیونکہ تیری رحمت ہمیشہ برستی رہی لیکن اب تو کس پردے میں جا چھپا ہے اور اپنے بناؤ سنگھار میں مصروف ہو گیا ہے کہ تیری رحمت کا برسنا بند ہو گیا ہے اور جو سب کبھی کوئی سوال تک نہیں کرتے تھے اب وہ سبھی عذر خواہ ہونے لگے ہیں۔تو جلدی اپنی رحمت کی بارش کر دے۔خدا کا آئینہ پرداز ہونا لبِ بے سوال کی عذر خواہی کا سبب بن گیا ہے یہی مفہوم ہے۔

{۴۰}

رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے
اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا ہے کہ اس شعر کی تمام شرحیں ناقص رہ گئی ہیں۔پھر اس شعر میں کئی لفظی محاسن ہیں جو شارحین سے عام طور پر نظر انداز ہو گئے ہیں۔خود فاروقی نے اس شعر کی جو شرح بیان کی ہے وہ ملاحظہ ہو۔شعر کے معنی یہ ہیں کہ عمر کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس کے ایک سال کی مدت ایک دور آفتاب نہیں بلکہ بجلی کی ایک چمک

کے برابر ہے۔ کسی حد تک یہ شرح ٹھیک ہے لیکن پوری طرح سے مفہوم اب بھی واضح نہیں ہوتا۔

دراصل یہ شعر "اس سال" کے محور پر گردش کر رہا ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ اس سال آفتاب برق کی رفتار اختیار کئے ہوئے ہے عمر کی رفتار میں ایک زبردست اضطراب سا ہے یعنی وقت بہت تیزی کے ساتھ گذرتا جارہا ہے۔ رفتار عمر کا اضطراب اور آفتاب کا برق بن جانا غالبؔ کے کمال فن کا ایسا ثبوت ہے جو ہرایرے غیرے شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔

شعر تو کوئی بھی کہہ لیتا ہے ایرا غیرا
عظمتِ فن جسے کہتے ہیں وہ آداب کہاں

عظمتِ فن کے یہ آداب ہمیں غالبؔ جیسے عظیم شاعر کے یہاں ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

{۴۱}

داغِ دل گر نظر نہیں آتا ہے
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

محترم فاروقی نے اس شعر کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے جلتے ہوئے یا جلے ہوئے گوشت اور اس کی بو کا مضمون آج کل کے طبائع کو ناگوار گذرے گا۔ میرؔ بھی اسے باندھ چکے ہیں۔

آتشِ غم میں دل بھنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

فاروقی نے ان دونوں ہی اشعار کو کسی خاص بلندی کا حاصل نہیں ٹھہرایا ہے۔

میں یہ وضاحت کردینا چاہتا ہوں کہ غالبؔ کے شعر میں گوشت کے جلنے کی بو کا مضمون قطعی نہیں ہے۔ نہ ہی جلنے اور بھنے کی طرف کوئی اشارہ کیا گیا ہے۔ جبکہ میرؔ کے شعر میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ "آتش غم میں دل بھنا شاید"۔ یعنی اس میں آتش غم بھی ہے اور اس

آتش سے دل کے جلنے کی بات بھی وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ غالبؔ کے شعر میں آتش نہیں ہے۔ جلنے کی طرف اشارہ بھی نہیں ہے تو پھر یہ شعر گوشت کے جلنے کی بو کے مضمون والا کیسے تسلیم کرلیا جائے۔؟ فاروقی صاحب اکثر اسی طرح اپنی راہ سے بھٹکتے ہیں۔ صحیح معنی میں غالبؔ کے اس خوبصورت شعر کو فاروقی سمجھنے میں ذرا سا چوک گئے ہیں۔

اردو شاعری میں داغِ دل کو اکثر شاعروں نے پھول سے تشبیہ دی ہے خود غالبؔ نے بھی کئی مقام پر ایسے شعر کہے ہیں جن میں داغِ دل کو پھول کہا ہے مثلاً۔

(۱) زخم دل میں ہے نہاں غنچۂ پیکانِ نگار
جلوۂ باغ ہے در پردۂ ناسور ہنوز

(۲) وقتِ خیالِ جلوۂ حسنِ بتاں اسدؔ
دکھلائے ہے مجھے دوجہاں لالہ زار

(۳) گلشنِ زخم کھلاتا ہے جگر میں پیکاں
گرہِ غنچہ ہے، سامانِ چمن بالیدن

حوالے کے طور پر چند اشعار میر کے بھی ملاحظہ ہوں

(۱) داغوں ہی سے بھری رہی چھاتی تمام عمر
یہ پھولِ گل چنا کیے باغِ وفا سے ہم

(۲) کیا داغوں سے رشکِ باغ اے صد آفریں الفت
یہ سینہ ہم کو بھی ایسا ہی تھا درکار بس بہتر

(۳) نہ تنہا داغِ نو سینے پہ میرے اک چمن نکلے
ہر اک لختِ جگر کے ساتھ سو زخم کہن نکلے

ایک بات یہ تو صاف ہوگئی کہ غالبؔ کا یہ شعر گوشت کے جلنے کی بو دینے والے

مضمون سے قطعی تعلق نہیں رکھتا بلکہ داغ دل کو پھول کے طور پر پیش کیا ہے اور اس کی وضاحت نہیں کہ پھول میں بو بھی ہوتی ہے۔ اب اگر اس شعر کی معنی آفرینی اور مضمون پر غور کریں تو فاروقی کا یہ دعویٰ جھوٹا ہو جاتا ہے کہ شعر کسی خاص بلندی کا حاصل نہیں ہے۔

اس سے پہلے کہ اس شعر کی شرح بیان کی جائے ذرا شوکت میر ٹھی کی اصلاح پر بھی غور کر لیا جائے۔ انہوں نے کہا ہے کہ غالبؔ نے دوسرا مصرع غالباً یوں کہا ہوگا۔ "بو بھی کیا چارہ گر نہیں آتی" اس پر بے خود موہانی نے سوال کیا ہے کہ کیا۔ "اے" سے "کیا" زیادہ فصیح ہے؟ "اے" میں ملامت کی شان اور تیور نظر آتے ہیں۔ فاروقی کا اس سلسلے میں خیال یہ ہے کہ بے خود موہانی سے شوکت میر ٹھی کا جواب نہ بن پڑا۔ فاروقی کے خیال میں چارہ گر سے تخاطب کے لئے "اے" کی ضرورت نہیں۔ "چارہ گر بو بھی نہیں آتی؟" میں بات پوری ہو جاتی ہے اور لفظ حشو ٹھہرتا ہے۔ شوکت میر ٹھی کی اصلاح سے حشو کا عیب رفع ہو جاتا ہے۔ آگے فاروقی فرماتے ہیں لہٰذا بظاہر تو لگتا ہے کہ غالبؔ یہاں چوک گئے ہیں یہ کوئی ایسی بات بھی نہیں آخر غالبؔ بھی انسان ہی تھے۔ لیکن تھوڑی سی اور بحث کے بعد محترم فاروقی نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ۔ "بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی" ہی بہتر ہے۔ اس میں غالبؔ نے اے چارہ گر کہہ کر چارہ گر کی چارہ گیری کو للکارہ ہے۔ اس کی بے عقلی ثابت کی ہے۔ ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ "اے چارہ گر"۔ میں غالب کے تیور موجود ہیں۔ شوکت میر ٹھی کی اصلاح میں کوئی دم نہیں ہے ویسا مصرع تو کوئی بھی عام شاعر گڑھ سکتا ہے۔ غالبؔ کی اصلاح شوکت میر ٹھی کے بس کی بات نہیں کہ ایک عظیم شاعر کے تیور کو وہ سرے سے جانتے ہی نہیں ہیں اب ذرا اس شعر کی شرح پر غور کیا جائے۔ شعر کے دو مفہوم نکلتے ہیں۔

(۱) اے چارہ گر تجھے میرا داغ دل نہیں نظر آرہا ہے؟ یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے۔ لیکن میرا یہ داغ دل تو پھول کی طرح مہکتا بھی ہے کیا تجھے اس کی بو بھی نہیں آئی؟

(۲) اے چارہ گر تو نے جو بو محسوس کی ہے یہ میرے داغ دل ہی کی تو ہے۔ وہ بھی صاف دکھائی دے رہا ہے اگر وہ دکھائی نہ دیتا تو یہ بو کہاں سے محسوس ہوتی۔ میرا داغ دل تو

عیاں ہے تیری نگاہ میں، ہی وہ تاب نہیں ہے کہ اسے دیکھ سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ غالبؔ نے بڑا ہی لاجواب مضمون شعر میں باندھا ہے جس کی تہہ تک پہنچنے میں تمام شرح لکھنے والوں کے پسینے چھوٹ گئے اور پھر بھی وہ اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر رہے۔ حالانکہ مضمون بالکل ہی سیدھا اور صاف تھا۔

{۴۲}

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
اگر بو دے بجائے دانہ دہقاں نوک نشتر کی

محترم شمس الرحمٰن فاروقی نے اس شعر کے آٹھ پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اسے مہمل قرار دیا ہے۔ جبکہ بے خود موہانی، نظم طباطبائی، آغا باقر اور حسرت موہانی نے اس بات پر اتفاق کیا کہ یہ شعر عاشق اور معشوق کے روحانی اتحاد کا مضمون بیان کرتا ہے۔ جس طرح لیلیٰ کے فصد کھلوانے پر مجنوں کے ہاتھ سے خون جاری ہو گیا تھا اسی طرح مجنوں کی آب بیتی سے لیلیٰ متاثر ہو گی۔

یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ شاعری تصور کی اڑان اور مبالغہ آرائی کا میدان ہے اس سفر میں کئی مقامات ایسے ہوتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جن کے لئے کوئی دلیل کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جاتا۔ لیلیٰ مجنوں کی کوئی تاریخی حقیقت نہیں ہے اردو شاعری میں یہ عاشق و معشوق کے استعارے ہیں جن کے ذریعے رومانی شاعری میں کئی انوکھے رنگ بھرے گئے ہیں ان رنگوں کے کچے پکے ہونے کی کوئی دلیل یا ثبوت مانگنا بے معنی ہے۔ ناقد کا فرض یہ ہے کہ وہ خیال کی وسعت، بیان کا حسن اور شاعری کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کا تجزیہ پیش کر دے شاعری میں تاریخی سچائی نہ ڈھونڈے۔

زیرِ بحث شعر میں مبالغہ آرائی عروج پر ہے لیکن یہی اس شعر کی خوبی ہے، حسن

بیان ہے۔اور ایسا پیچیدہ مضمون اس قدر مہارت سے باندھنے کا ہنر غالبؔ ہی کو آتا ہے۔ شعر کی شرح ملاحظہ ہو۔

اگر مجنوں کے دست میں کوئی کسان نوک نشتر دانوں کی جگہ بودے تو نشتروں کی فصل لہرانے کے بعد وہاں کی جو خاک اڑاڑ کر لیلیٰ کے جسم پر لگے گی وہ لیلیٰ کی نسوں پر اثر انداز ہوگی اور اس کے جسم پر ریشے نکل آئیں گے یعنی جدائی کے نشتر کھائے ہوئے مجنوں کی طرح لیلیٰ بھی تڑپ اٹھے گی اور مجنوں سے ملنے کے لئے بیتاب ہو جائے گی ایسی حالت میں دو محبت کرنے والوں کے ملن کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

اس کی ایک شرح اس پہلو سے بھی ہو سکتی ہے کوئی کسان نوک نشتر کی فصل اگائے گا تو دشت مجنوں کی خاک کو لیلیٰ کے وہ نشتر یاد آنے لگیں گے جو اس نے مجنوں پر چلائے تھے۔ یہ خاک لیلیٰ سے اس کی بیوفائی کا بدلا لینے کے لئے اس کی رگوں کو ریشہ ریشہ کر مجنوں کے زخموں کی یاد تازہ کردے گی۔ نشتر لگانے سے جسم پھٹتا ہے اسلئے نوک نشتر بونے کی بات کہی گئی ہے ۔نوک نشتر اور رگ لیلیٰ کے ریشہ ریشہ ہونے میں جو رشتہ غالبؔ نے قائم کیا ہے۔ اس نے معنی آفرینی کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ شعر قطعی مہمل نہیں ہے بڑی خوبیوں والا ہے۔ اور اس کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا مضمون اردو شاعری میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتا ہے۔

{۴۳}

گریہ نکالے ہے تیری بزم سے مجھ کو
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں

کئی ایڈیشنوں میں اولیٰ مصرع میں تیری کی جگہ تری شائع ہوا ہے۔ فاروقی نے اس پر طویل بحث کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ "تری" رکھنے پر مصرع بحر سے خارج ہو جاتا ہے اسلئے "تیری" ہی درست ہے۔

جہاں تک شرح کا سوال ہے اس شعر کی شرح کوئی خاص مشکل نہیں ہے۔ ایسے شعر کی شرح ہر کوئی آسانی سے لکھ سکتا ہے لیکن غالبؔ کے تیور کو سمجھ سمجھ کر لکھنا ذرا مشکل بھی ہو جاتا ہے۔ میں اپنی شرح بعد میں بیان کروں گا پہلے جو فاروقی صاحب نے بیان کی ہے اسے دیکھ لیں۔

مجھے رونے پر اختیار نہیں ہے آنسوؤں کے نکل آنے کا نتیجہ ہے کہ مجھے تیری بزم سے نکلنا پڑ رہا ہے یعنی آنسوؤں پر تو میرا اختیار نہیں ہے لیکن میں آنسوؤں کے اختیار میں ہوں جب وہ نکلتے ہیں تو میں بھی نکلتا ہوں۔ پھر اشارہ ملتا ہے کہ رونے پر تو اختیار نہیں ہے لیکن کسی اور چیز پر اختیار ہے وہ چیز میرا نکلنا ہی ہو سکتی ہے لیکن وہ بھی میرے اختیار میں نہیں ہے کیونکہ یہ گریہ ہی تو ہے جو مجھے تیری بزم سے نکال رہا ہے۔

شرح کم ہے لفاظی زیادہ ہے کئی جملے بار بار دوہرائے گئے ہیں کچھ تو میں نے کم بھی کر دیئے ہیں۔ اس شرح سے شعر کتنا سمجھ میں آتا ہے یہ تو پڑھنے والا جانے۔ خیر۔

ہم نے جو کچھ لکھا ہے غالبؔ کے تیور کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھا ہے۔ شرح ملاحظہ ہو۔

متکلم ایسا غیرت مند ہے کہ وہ معشوق کے سامنے رونا نہیں چاہتا۔ ایسا کرنا وہ اپنی توہین سمجھتا ہے۔ ادھر مشکل یہ ہے کہ اسے اپنے رونے پر اتنا بھی اختیار نہیں ہے کہ وہ اپنے آنسوؤں کو ضبط کر لے۔ ایسی حالت میں اس کے سامنے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ معشوق کی بزم سے اٹھ کر چلا جائے اور کہیں باہر جا کر آنسوں بہالے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ متکلم نے اب تک اپنے معشوق کے سامنے رونا شروع نہیں کیا ہے آنسوں ابھی چھلکے نہیں چھلکنے والے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ آنسوں چھلک جائیں متکلم بزم سے اٹھ کر چلا جانا چاہتا ہے۔ اگر رونا جاری ہے (جیسا کہ دیگر شرح نگاروں نے لکھا ہے اور فاروقی نے بھی بیان کیا ہے) اور معشوق نے بھی دیکھ لیا ہے تو ایسی صورت میں بزم سے اٹھ کر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہیں بیٹھ کر رونے میں کیا قباحت ہے؟ غیرت کی بات تو یہ ہے کہ آنسو چھلکنے سے پہلے ہی بزم سے نکل جائے۔ غالبؔ نے یہ تیور سمجھنے کے لئے بھی تیور چاہئے۔

{۴۴}

ہم سے عبث ہے گمان رنجشِ خاطر
خاک میں عشاق کی غبار نہیں

محترم شمس الرحمٰن فاروقی کا اس شعر کے تعلق سے بیان ہے کہ نظم طباطبائی کا یہ کہنا کہ ''خاک'' بہ معنی سرشت، طینت خلافِ محاورہ ہے اور غالبؔ نے یہ لفظ محض غبار کی مناسبت سے لکھ دیا ہے۔ یہ اعتراض اتنا باوزن معلوم ہوتا ہے کہ آج تک کسی سے اس کا جواب نہ بن پڑا ہے۔

اس بحث کو طول دینے میں فاروقی یہ بھی بھول گئے کہ انہیں اس شعر کی شرح بھی لکھنا ہے۔ اس شعر کی شرح ہم بعد مین بیان کریں گے پہلے اس بحث کو نپٹا دیا جائے جو نظم طباطبائی اور فاروقی نے شروع کی ہے اور جس کا جواب اب تک کسی نے بھی نہیں دیا ہے۔ سب سے پہلے خاک کے معنی پر غور کر لیا جائے۔

''خاک'' کے معنی ہیں۔ دھول، مٹی

''سرشت'' بہ معنی۔ خو، خصلت، مزاج، فطرت، خاصیت سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نہ تو سرشت کے معنی خاک یا مٹی ہیں اور نہ ہی غالبؔ نے خاک بمعنی سرشت استعمال کیا ہے۔ غالبؔ نے خاک کے وہی معنی لئے ہیں جس سے خاک کا پتلا یعنی انسان بنا ہے وہ انسان جو عشق کرتا ہے جسے عشاق بھی کہتے ہیں۔ اس خاک میں کیا کیا ہوتا ہے ؟ دھول، مٹی یعنی خاک میں غبار یعنی دھول بھی مٹی کے ساتھ شامل ہوتی ہے۔ لیکن زیر بحث شعر میں عشاق کی جو خاک ہے اس میں دھول بالکل نہیں ہے۔ دھول وہ جو اڑتی ہے غبار بھی اڑتا ہے۔ مٹی اڑتی نہیں ہے جمی ہوئی رہتی ہے عشاق کی خاک میں یہی مٹی ہے غبار نہیں ہے۔ خاک، مٹی اور غبار میں جو امتیاز غالبؔ نے پیش کیا ہے اس کا تجزیہ نہ تو نظم طباطبائی کر سکے نہ فاروقی۔

یہ عام بول چال کے جملے ہیں کہ انسان خاک کا پتلا ہے، تم آخر کس مٹی کے بنے ہو

، تمہاری مٹی کہاں کی ہے، کسی کو یہ کہتے آج تک نہیں سنا کہ انسان سرشت کا پتلا ہے، تم کس سرشت کے ہو یا تمہاری سرشت کہاں کی ہے ؟ اور کوئی اس طرح کا جملہ بھی نہیں بولتا کہ تمہاری سرشت میں غبار نہیں یا تمہاری خصلت میں غبار نہیں، تمہارے مزاج میں غبار نہیں یا تمہاری خاصیت میں غبار نہیں۔ لیکن یہ تو کہا ہی جاسکتا ہے کہ تمہاری خاک میں غبار نہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو غالبؔ نے خاک کا جو استعمال کیا ہے وہ بڑا ہی معنی خیز ہے اور نظم طباطبائی کا یہ کہنا کہ خاک بہ معنی سرشت خلاف محاورہ ہے نہایت ہی بھونڈا اعتراض ہے جس میں فاروقی کو پتہ نہیں کہاں سے وزن دکھائی دے گیا۔ ؟

خاک اور غبار کی مناسبت سے غالبؔ کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں

اب ذرا آگے بڑھا ہوں تو محترم فاروقی کا ایک اور چمتکار نظر سے گزرا ہے ۔"خاک" کے ایک نئے معنی کی ایجاد انہوں نے کر ڈالی اور یہ معنی ہے "سانچا" میں تمام لغات کھنگال چکا ہوں لیکن خاک بہ معنی سانچا کہیں دکھائی نہیں دیا۔

اسی لئے معنی کی بنا پر انہوں نے شعر کی شرح بھی لکھ دی ہے۔ عشاق جس سانچے میں ڈھلے ہیں یعنی جیسی ان کی فطرت ہے اس میں غبار (کدورت) بالکل نہیں ہے۔ اور جب ان کی فطرت میں غبار نہیں تو آپ کا یہ گمان کہ ان کے دل میں آپ کی طرف سے غبار ہوگا یا وہ آپ کو غبار آلود کریں گے غلط ہے۔

کسی کو غبار آلود کر دینے کا خیال فاروقی کے دماغ کی اپج ہے غالبؔ کے شعر میں یہ بات بھی نہیں ہے۔

اس شعر کی صاف ستھری شرح اس طرح ہے ملاحظہ ہو۔ یہ آپ کا وہم و گمان ہے کہ ہم کسی سے رنجش رکھتے ہیں اصل بات تو یہ ہے کہ ہم عشق کرنے والے جس مٹی سے بنے ہیں اس میں غبار نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔

{۴۵}

پابہ دامن ہو رہا ہوں بس کہ میں صحرا نورد

خارِ پا ہیں جوہرِ آئینہ زانو مجھے

غالبؔ کے اس شعر کی شرح بڑے بڑے عالم اور دانشوروں نے اپنے اپنے انداز سے کی ہے ان کی تھوڑی تھوڑی جھلک ہم ضرور پیش کرنا چاہیں گے۔ اس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ غالبؔ کے ایک ہی شعر کو کتنے پہلوؤں سے دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

نظم طباطبائی نے شعر میں ایک نکتہ نکالتے ہوئے لکھا ہے کہ چونکہ زانوں اور پاؤں متصل ہیں اسلئے پاؤں کے کانٹے آئینہ زانوں کا جوہر بن گئے ہیں۔ ظاہر ہے بات بنی نہیں اس لئے وہ یہ بات کہہ کر دامن چھڑا گئے کہ اس شعر میں تشبیہ کا لطف تو ہے لیکن معنی کا لطف نہیں۔ اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تشبیہ کا لطف ہوتا ہے وہاں معنی کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

بے خود موہانی نے "پابدامن" کے معنی "ایک جگہ بیٹھ رہنے کے بتائے ہیں "مفہوم انہوں نے یوں بیان کیا ہے کہ صحرا نورد عاشق اپنے پاؤں میں کانٹے چبھ جانے کے باعث دشت نوردی سے محروم ہے اور زانوں پر پاؤں رکھے ہوئے کانٹوں کو دیکھ کر کہتا ہے کہ ان ہی کم بختوں کی وجہ سے پاؤں توڑے بیٹھا ہوں۔ یہ شرح بھی ناقص ہے۔

مولانا نیاز فتح پوری فرماتے ہیں۔ زانوں کو آئینہ کہنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ آئینے کو زانوں پر رکھ کر دیکھا جاتا ہے اور دوسری یہ کہ زانوں کی ہڈی آئینے کی طرح ہوتی ہے۔ آئینہ زانوں کے جوہر مجھے بالکل خارپا کی طرح نظر آتے ہیں۔ یہ شرح بھی آدھی ادھوری سی ہے۔

باقر کے مطابق۔ "میں صحرا نورد تھا لیکن پاؤں میں کانٹے چبھ جانے سے میں معذور ہو گیا اور اب پابدامن بیٹھا ہوں۔ وہ کانٹے جو صحرا نوردی میں میرے پاؤں میں چبھے

تھے آئینہ کا جوہر معلوم ہوتے ہیں"۔ اسے ایک اچھی کوشش کہا جاسکتا ہے۔

محترم فاروقی کا خیال یہ ہے کہ شارحین نے اس شعر کے معنی میں اتنی الجھنیں پیدا کردی ہیں کہ ان کو دیکھ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ واقعی اس شعر میں معنی کا کچھ لطف نہیں اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کچھ شرح نگار اگر کسی شعر کی شرح لکھنے میں ناکام ہو جائیں تو اس شعر میں جو اصل معنی آفرینی ہے وہ ختم ہو جائے گی؟ نہیں ایسا قطعی نہیں ہوگا۔

خود فاروقی نے اس شعر کی شرح معنی کا لطف ختم ہو جانے کے بعد یوں بیان کی ہے
۔"میں صحرا نورد تھا وحشت کے عالم میں اتنی فرصت کہاں تھی کہ آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر اپنی حالت کا جائزہ لیتا۔ اب میں صحرا نوردی ترک چکا ہوں مایوسی میں گھٹنے پر سر ٹکائے بیٹھا ہوں گویا آئینہ زانوں میں اپنا منہ دیکھ رہا ہوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ کانٹے جو عالم صحرا نوردی میں میرے پاؤں میں چبھے تھے وہی اس آئینے کا جوہر ہیں۔ نہ میرے پاؤں میں کانٹے چبھے اور نہ میں اس طرح پاؤں توڑ کر گھٹنے پر سر ٹیک کر بیٹھتا کہ آئینہ زانو میں منہ دیکھنا نصیب ہوتا مفہوم کافی واضح ہو چلا ہے لیکن پاؤں توڑ کر گھٹنوں میں سر ٹکانے کی بات شعر میں نہیں ہے۔ آخر میں ذرا ہم بھی کوشش کر لیتے ہیں کہ غالبؔ نے زیر بحث شعر میں کیا کہا ہے۔ شرح ملاحظہ ہو۔

جو پاؤں کبھی صحرا نوردی میں مصروف رہے تھے اب پابدامن ہو گئے ہیں یعنی اب وہی پاؤں میرے دامن تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں کیونکہ میرے پاؤں میں کانٹے چبھ گئے ہیں۔ میں اپنے کانٹے چبھے پاؤں جب اپنے زانوں پر رکھ کر کانٹے نکالنے کی کوشش کرتا ہوں تو میرے پاؤں کا حصہ کسی آئینے کی طرح دکھائی دینے لگتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میرے زانوں پر آئینہ رکھا ہوا ہو۔ اس پاؤں میں جو کانٹے چبھے ہوئے ہیں وہ جوہر آئینہ کا منظر پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں اور میرا زانوں جوہر آئینہ زانوں کی مکمل تصویر نظر آتا ہے۔ یہ شعر نہیں گنجینۂ معنی کا طلسم ہے پابدامن اور آئینہ زانوں میں جو ربط ہے جب تک اسے نہ سمجھ لیا جائے یہ شعر ہر ایک کی سمجھ سے پرے ہی رہے گا۔ ایسی حالت میں فاروقی اور نظم طباطبائی کی طرح شعر کو بے معنی کہہ دینا میدان چھوڑ کر بھاگنے کے سوا کیا ہے؟

{۴٦}

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے

ایک بار پھر غالبؔ کے اس شعر نے تمام علم ودانش کا دعویٰ کرنے والوں کو گھاس کھودنے پر مجبور کردیا ہے۔ کوئی بھی اس کے صحیح مفہوم کی تہہ تک پہنچ نہیں پایا ہے۔ دماغ عجز عالی نے شرح نگاروں سے وہ عاجزی کروائی ہے کہ بس دیکھتے ہی بنتا ہے وہ پہلو ہی کیا ہے کہ کسی کو بھی مفہوم کے پاس تک پھٹکنے نہیں دیا ایسے میں غالبؔ کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔

آیئے کچھ شرح دیکھیں۔ سب سے پہلے مولانا نیاز فتح پوری کی شرح پر نظر ڈالتے ہیں جنہوں نے غالبؔ کی مشکلات کو حل کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا دیکھیں کہ یہ مشکلات حل کرنے میں انہوں نے کیا کچھ کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ شرح بیان کرتے ہیں۔ غیر ضروری مباحث میں الجھے بغیر اگر سادہ الفاظ میں غالبؔ کے مشکل اشعار کا مفہوم ظاہر کردیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ شعر میں مقصود صرف عالی ظرفی کا اظہار ہے جس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص میری طرف سے پہلو تہی بھی کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ میری جگہ بدستور خالی ہے۔ اس شرح کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ اس میں عالی ظرفی کہیں نظر نہیں آتی بلکہ بے شرمی اور ڈھیٹ پن دکھائی دیتا ہے شعر مولانا کی سمجھ میں آیا ہی نہیں۔

حسرت موہانی کہتے ہیں "میرے عجز کا درجہ یہاں تک بڑھا کہ تغافل کو دوست رکھنے لگا ہوں۔ پس اس صورت میں ظاہر ہے کہ آپ پہلو تہی کریں گے تو گویا میرا پاس کریں گے۔" بات کچھ بنی نہیں۔ شرح نگاری کا حق ادا نہ ہوسکا۔

بے خود دہلوی فرماتے ہیں... "میری طینت میں عجز وانکسار کا مادہ اس قدر زیادہ پیدا کیا گیا ہے کہ میں اغماض کو اکرام سمجھتا ہوں۔" غالبؔ اور عجز وانکسار؟ تو پھر غالبؔ کی

طرز ادا کو آپ نے سمجھا ہی نہیں۔

محترم شمس الرحمٰن فاروقی نے بڑی محنت کی ہے اور اس محنت کا نتیجہ یہ ہے کہ تین شرح انہوں نے زیر بحث شعر کی لکھی ہے۔

(۱) یعنی لوگ تغافل کو ناپسند کرتے ہیں لیکن میں اپنی عاجزی کی بنا پر تغافل کو پسند کرتا ہوں یہ میری امتیازی صفت ہے اسلئے مجھے اس پر گھمنڈ ہے لہٰذا اگر آپ مجھ سے اجتناب کریں تو میری بھی جگہ خالی پائیں گے۔

عاجزی کی بنا پر تغافل کو پسند کرنا اور اس پر گھمنڈ کرنا کہاں عاجزی اور کہاں گھمنڈ؟ فاروقی صاحب دونوں الفاظ کے معنی تو خوبی جانتے ہی ہونگے یہ بھی "میر ادماغ عجز عالی" کے مارے ہوئے ہیں۔

(۲) دوسرا مفہوم... میں تغافل کو پسند کرتا ہوں اور ایسا بھی ہے کہ اپنے عجز پر میں مغرور بھی بہت ہوں۔ لہٰذا اگر آپ نے اجتناب کیا تو میں بھی محفل میں جگہ خالی کردوں گا۔

تھوڑا سا الٹ پھیر ضروری ہے لیکن پھر وہی "اپنے عجز پر میں مغرور بھی بہت ہوں" بات گلے سے نہیں اترتی ہے۔

(۳) تیسرا مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے اپنی عاجزی پر گھمنڈ ہے اور اس درجہ گھمنڈ ہے کہ اسی بنا پر میں تغافل کو پسند کرتا ہوں لہٰذا اگر آپ مجھ سے اجتناب کریں گے تو میں اور بھی خوش ہوں گا اور سمجھوں گا کہ آپ نے میرے لئے جگہ خالی کردی۔

پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ بات یہاں بھی نہیں بنی اب ہم اپنی شرح پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو.... متکلم کہہ رہا ہے کہ میری کسی مائی کے لال سے دوستی نہیں ہے میرا دوست تو تغافل ہے اسلئے میں ہر ایک سے بے نیاز رہتا ہوں۔ خدا نے مجھے وہ دماغ دیا ہے کہ بڑے بڑے میری عاجزی کرتے ہیں پھر تمہاری تو اوقات ہی کیا ہے تم مجھ سے کیا پہلو تہی کروگے؟ اس سے پہلے کہ تم مجھ سے دامن بچاؤ میں خود تمہارے قریب سے اٹھ کر چلا جاؤں گا یعنی میں وہ غیرت مند ہوں کہ تمہیں پہلو تہی کرنے کا موقع تک نہ دوں گا

۔خاص غالبؔ کے مزاج اور تیور کا شعر ہے۔ اچھے اچھوں کو پٹخنی دے دیتا ہے۔

{۴۷}

بے خودی بسترِ تمہید فراغت ہو جیو

پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

پھر غالبؔ کا ایک بے مثال اور اعلیٰ درجے کا شعر زیر بحث آیا ہے اس بار بھی شرح نگاروں کی عقل جواب دے گئی ہے اور ایسا جب ہوتا ہے تو نظم طباطبائی غالبؔ کے شعر میں خامیاں ڈھونڈ کر اپنا نزلہ اتار دیتے ہیں۔ یہ جھلاہٹ فطری ہے کہاوت مشہور ہے کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ لیکن ہمیں نظم طباطبائی کی اس حالت پر ترس آتا ہے۔

فاروقی ایسے موقعوں پر نظم طباطبائی کی پیٹھ ہی نہیں تھپتھپاتے بلکہ ان کی مدح سرائی کا فرض بھی ادا کرنے لگتے ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے لکھا ہے آفریں ہے طباطبائی پر کہ ایک طرف تو انہوں نے کلام غالبؔ کی نکتہ رسی میں ایک معیار قائم کیا ہے کہ اچھے اچھے اس تک نہ پہنچ پائے اور دوسری طرف انہوں نے غالبؔ پر نکتہ چینی حتیٰ کے غالبؔ کی تحقیر کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور جب ان پر جوش کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ مناسب موقع کا بھی انتظار نہیں کرتے بلکہ بے موقع ہی چاند ماری کر ڈالتے ہیں۔ چنانچہ شعر زیر بحث میں لفظ "ہو جو" کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ "ہو جیو" خود ہی ایک واہیات لفظ ہے مصنف نے اس پر اور طرہ کیا کہ تخفیف کر کے ہو جو بنایا۔ فاروقی اس پر سوال کرتے ہیں کہ لفظ "ہو جیو" کو واہیات قرار دینے سے پہلے طباطبائی کو چاہیئے تھا کہ وہ انیسویں کی اوائل اور وسط میں رائج محاورہ کی چھان بین کرتے اور دیکھتے کہ اس زمانے کے شعراء کا رویہ اس لفظ کے بارے میں کیا تھا۔

بے خود موہانی نے "ہو جو" کو اساتذہ دہلی کے تصرفات قادرانہ کی مثال بنایا ہے ۔فاروقی کے حساب سے یہ دفاع ناکافی اور غیر ضروری ہے۔ اس بحث کو فاروقی نے بہت

طول دیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ طباطبائی کے اس اعتراض پر شرح نگار ایسے الجھے کہ انہیں پھر شعر کے اصل مفہوم تک پہنچ جانے کی راہ سجھائی ہی نہیں دی۔ ہم ایسی کوئی غلطی اس لئے نہیں کر سکتے کہ غالبؔ کی شاعری کی تھوڑی بہت سمجھ خدا نے ہمیں عطا کی ہے اور نظم طباطبائی جیسا کوئی بھی اہل علم ہمیں اپنے اثر کے تحت گمراہ نہیں کر سکتا۔

پہلے مصرع میں جہاں "ہو جو" نے سب کو پریشان کیا ہے وہیں مصرع ثانی میں ردیف مجھ سے اوپر ہے سائے کی طرح نے سب کو اندھیرے میں دھکیل دیا ہے۔ یوسف سلیم چشتی نے ثانی مصرعے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جس طرح سائے کا گھر سائے سے معمور ہوتا ہے۔" بے خود موہانی فرماتے ہیں۔ "میرا شبستاں اس طرح پر ہے جس طرح سائے سے سایہ دار چیز" بے خود دہلوی کا خیال ہے۔ سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے بھرا ہوا ہے۔" حسرت موہانی کا ارشاد ہے "میرا شبستاں مجھ سے پر ہے جس طرح سائے سے پر ہوتا ہے"۔ کسی نے بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ شبستاں میں موجود رہنے والے سایہ چونکہ نہیں ہو سکتا وہ تو کسی ایک مخصوص سمت ہی میں پڑے گا اسلئے اس کے سائے سے تمام شبستاں کا سائے سے پر ہونا بے معنی ہے۔ یعنی یہ تمام شرحیں ناقص ہوئیں۔

جہاں تک نظم طباطبائی کے "ہو جو" پر اعتراض کا سوال ہے ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ غالبؔ نے ایک بار پھر مولانا کو وہ دھوبی پاٹ مارا ہے کہ ان کے ہوش تک ٹھکانے نہیں رہے ہیں۔ زبان وبیان اور الفاظ کے برتاؤ میں غالبؔ اپنے عہد کا سب سے زیادہ چوکنا اور باخبر شاعر ہے ایسا کہ ذوقؔ اور مومنؔ بھی اس کے آگے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔ جس کی تنقیدی بصیرت کا یہ عالم ہو کہ "ہم نے دست امکاں کو ایک نقش پاپایا" کے "پاپایا" تک کو گوارا نہ کر سکے وہ "ہو جو" کیسے گوارا کر سکتا تھا؟ ہاں لیکن اس کی ذہانت "ہو" اور "جو" کو الگ الگ ضرور قبول کر سکتی ہے۔ اس میں "ہو" مصرع اولیٰ کے لئے ہے تو "جو" کا رشتہ ثانی مصرع سے غالبؔ نے جوڑ دیا ہے اسی فنی مہارت اور شعری نزاکت کو پرکھنے کے لئے بڑی باریک بینی کی ضرورت ہے ہر کسی کی موٹی عقل کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس کا صحیح

تجزیہ کرسکے۔ شعر کی شرح سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ شرح ملاحظہ ہو۔

یہ جو میرا شبستاں سائے سے پر ہے یا گھنا سایہ دار ہے فرصت کے لمحوں میں یعنی جب فراغت ہو میری بے خودی کے لئے بستر تمہید بن جاتا ہے آرام کا سبب ہو جاتا ہے اور میں بڑے مزے سے اس میں آرام کرتا ہوں۔

شعر کے الفاظ ذرا اس ترتیب سے لکھ کر دیکھیں تو میری بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔ میرا شبستاں جو پر ہے سائے کی طرح (جب) فراغت ہو (تو) مجھ سے (میرے لئے) بے خودی (میں) بستر تمہید (ہے)

یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غالبؔ کے اشعار کی شرح لکھنا کوئی ہنسی ٹھٹائی نہیں ہے ۔یہ کام تو پل صراط سے گذرنے جیسا ہے جو بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ اچھے اچھوں کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے بڑے بڑے ماہر لڑکھڑاتے دیکھے گئے ہیں۔ پھر بھلے ہی وہ نظم طبا طبائی ہوں یا بے خود موہانی، شوکت میرٹھی ہوں یا بے خود دھلوی، حسرت موہانی ہوں یا نیاز فتح پوری، شمس الرحمٰن فاروقی ہوں یا خاکسار ہر قدم بہت ہی سمجھ بوجھ سے اٹھانا پڑتا ہے۔

{۴۸}

سر مشک سر بہ صحرا داد نوز العین دامن ہے
دل بے دست و پا افتادہ بر خوردار بستر ہے

یہ شعر غالبؔ کے کمال اور فنی خوبیوں سے مالامال ہے۔ لیکن فاروقی کے خیال سے اس شعر میں مضمون اور معنی کی ندرت ہے لیکن کوئی خاص باریکی نہیں ہے۔اس کا مفہوم بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے۔ "مفہوم تو یہ ہے کہ آنسو جو صحرا کا ارادہ کر کے نکلا تھا دامن کو بہت پیارا ہے اور وہ دل جو بے دست و پا پڑا ہوا ہے بستر کا برخوردار ہے"۔ شعر کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ آنسوں آنکھ سے نکلتا ہے اور اس میں آب ہوتی ہے اس اعتبار سے

آنسوں کو نور العین یعنی آنکھ کا نور کہنا مزید لطف دیتا ہے۔ دل کی ایک صفت افتادگی بھی ہے اس لحاظ سے دل کو بے دست وپا افتادہ کہنا بھی خالی از لطف نہیں رہا۔ محترم فاروقی کی یہ شرح واقعی بہت خوب ہے۔ لیکن جن پہلوؤں پر ہماری نظر گئی ہے ہم ان کی وضاحت کر دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

مصرع اولیٰ میں ”صحرا داد“ اور مصرع ثانی میں ”افتادہ“ میں مناسبت ہے وہی ”نور العین دامن“ اور ”بر خوردار بستر“ میں ہے۔ الفاظ کی یہ بناوٹ یہ کاریگری ہمیں غالبؔ ہی کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جس آنسو کو کسی صحرا میں جا کر گرنا چاہیئے تھا وہ میرے دامن میں میری اولاد کی طرح موجود ہے اور میرے دل کی یہ حالت ہے کہ بے دست وپا دکھ جھیلنے والی اولاد کی طرح بستر پر پڑا ہوا ہے۔ یعنی میری دو اولادیں ہیں ایک آنسو جو میرے دامن پر بوجھ ہے اور دوسری اولاد میری دل جو افتادہ ہے ستم رسیدہ ہے یعنی میری یہ دونوں ہی اولادیں ناکارہ ہیں میری زندگی پر بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ آنسوں اور دل دونوں ہی انسان کے پیدا کردہ ہیں انہیں غالبؔ نے اولاد کہہ کر جو معنی پیدا کر دیئے ہیں وہ لاجواب ہیں۔

{۴۹}

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جاوے

غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جاوے

مولانا طباطبائی نے اپنی علمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غالبؔ نے پہلے ”یہ ڈر ہے“ لکھا ہوگا لیکن انہوں نے بعد میں خیال کیا ہوگا کہ یہ کی ہائے ہوز کا گرنا خالی از ثقل نہیں اسلئے یہ ڈر ہے ”کو بدل کر خطر ہے“ کر دیا۔ طباطبائی مزید لکھتے ہیں کہ گو اس ”ہ“ کا گرنا درست ہے، مگر خالی از ثقل نہیں، خصوصاً ابتدائے کلام میں۔ فاروقی نے اس کا بھرپور جواب دے دیا ہے ۔ابتدائے کلام ہو یا کوئی اور مقام ”یہ“ کی ہائے ہوز ساقط کر دینے میں کوئی عیب نہیں۔ خود غالبؔ اور میرؔ کے یہاں اس کی درجنوں مثالیں ہیں۔ ان سے پہلے والوں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ فاروقی

نے دو اشعار بھی مثال کے طور پر پیش کر دیئے ہیں جو یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔

غالبؔ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

میرؔ یہ سنا تھا میرؔ ہم نے کہ فسانہ خواب لا ہے
تری سرگزشت سن کر گئے اور خواب یاراں

ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ غالبؔ کا ذہن "یہ ڈر ہے" کی طرف نہ تو گیا ہوگا نہ ہی "یہ ڈر ہے" لکھنے کے بعد اس کی جگہ "خطر ہے" رکھا ہوگا۔ کیونکہ خطر ہے بے ساختہ یہاں آیا ہے جبکہ یہ ڈر ہے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی پھٹے میں پیوند لگا رہا ہو۔ پھر جو مزہ خطر میں ہے وہ ڈر میں نہیں ڈاکٹر اقبالؔ کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس شعر میں بھی ہم خطر کی جگہ "خوف" یا "ڈر" کوئی بھی لفظ متبادل کے طور پر نہیں رکھ سکتے اور اگر رکھنے کی بجا کوشش کریں گے تو شعر کی وضاحت پر اس کا برا اثر پڑے گا ۔کچھ ایسی ہی بات غالبؔ کے زیر بحث شعر میں بھی ہے۔

اب اگر شرح پر غور کریں تو فاروقی نے ایک جملے میں شعر کی شرح یوں بیان کی کر دی ہے ۔یہ کہنا کافی تھا کہ رشتہ الفت کے رگ گردن بن جائے میں تیری دشمنی کا خطرہ ہے۔ لیکن فاروقی یہ بھی کہتے ہیں ہے کہ معنی وہی بہتر ہے جو بے خود موہانی نے بیان کئے ہیں۔ بے خود موہانی کی شرح ملاحظہ ہو۔ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، یعنی میں تیری محبت کے رشتے میں بندھا ہوا ہوں۔ تجھ سے محبت کر کے میں مغرور ہو گیا ہوں۔ ایسا نہ ہو اس غرور کی سزا مجھے یہ ملے کہ میرا دشمن ہو جائے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ شعر میں مستقبل کے اندیشے کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ بے خود موہانی نے شرح میں حال کا بیان ہے۔ ہمارے حساب سے اس کی شرح یوں ہونا چاہئیے

۔مجھے اندیشہ ہے یا مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ یہ محبت کا رشتہ اس بلندی پر نہ پہنچ جائے کہ رگ گردن کی شکل اختیار کر لے اگر کہیں ایسا ہوا تو میری گردن غرور سے تن جائے گی لیکن جب دوستی میں غرور پیدا ہو جاتا ہے تو آفت ٹوٹ پڑتی ہے عاشق و معشوق میں ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے ایسی حالت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تو میرا دشمن ہو جائے مفہوم یہ ہے کہ محبت کا رشتہ ایک مخصوص حد تک ہی بھلا معلوم دیتا ہے حد سے بڑھنے پر دشمنی کا خطرہ ہے۔

{۵۰}

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا
کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

محترم شمس الرحمٰن فاروقی نے نظم طبا طبائی کی تعریف بھی کی ہے اور ان سے سوال بھی پوچھا ہے۔ طبا طبائی نے خوب لکھا ہے! "یہاں ساگر کو دست گرداں کہنا ایسا لطف رکھتا ہے کہ دل و دیں نیاز مصنف کرنا چاہے۔" لیکن دست گرداں کے معنی کیا ہیں ؟ بڑی طویل بحث ہے دست گرداں پر۔

نیاز فتح پوری کہتے ہیں کہ دست گرداں وہ شے ہے جو عارضاً حاصل کی جائے۔

"بہار عجم" میں دست گرداں کے معنی قرض بہ عاریت گرفتن ہے۔

پلیٹس نے دست گرداں کے معنی بیان کئے ہیں دست بہ دست جانے والا۔ جو مال پکار پکار کر فروخت کیا جائے۔ لیکن زیادہ تر شارح نے شرح لکھتے وقت دست گرداں کے معنی "نقد" لئے ہیں۔ اور شرح یوں بیان کی ہے۔ اگر تم ساقی سے ساغر محبت یا ساغر شراب کا سودا کرنا چاہے تو دل و دیں کا نقد پیش کرو کیوں کہ اس بازار میں ساغر صرف نقد ہی قیمت پر ملتا ہے۔ یہ شرح ہمارے حساب سے نامکمل ہے۔

اس سے پہلے کہ زیر بحث شعر پر ہم اپنی شرح بیان کریں۔ دست گرداں کے معنی

کی وضاحت کردیں گردش بہ معنی چکر، گھومنا۔ گردوں۔ گھومنے والا آسمان۔

گرداں :۔ پھرنے والا، گھومنے والا، ستاہوا، پٹاہوا

دست گرداں :۔ ہاتھوں ہاتھ گھومنے والا، ہاتھوں ہاتھ لٹنے والا۔

ظاہر یہ ہوا کہ دست گرداں کے معنی نقد قطعی نہیں ہے۔ اسلئے شعر کا مفہوم ہوا۔ اگر ساقی سے سودا کرنا ہے تو دین ودل کے نقد لٹانا سیکھ لے کہ ان کے بدلے ہی میں ہاتھوں ہاتھ لٹنے والا دھن یعنی ساغر تجھے حاصل ہو سکتا ہے۔ دل بھی لٹتا ہے دین بھی لٹ جاتا ہے اور شراب بھی ہاتھوں ہاتھ لٹتی ہے دست گرداں کہہ کر غالبؔ نے واقعی لطف پیدا کردیا ہے۔ بے ساختہ غالبؔ ہی کا ایک اور مصرع یاد آرہا ہے۔

جس کو ہودین ودل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

{۱}

نقش ہے لوحِ جہاں پر یوں مری تحریر کا
مہرِ گردوں سلسلہ در سلسلہ تنویر کا

ہے سراپا ہی برہنہ یوں تو یہ حرفِ غزل
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

لمحہ لمحہ ہے صدی کے کرب میں ڈوبا ہوا
مجھ کو کیا مشکل اگر لانا ہو جوئے شیر کا

برق رفتاری مرے حرفِ سخن کی دیکھئے
کام لیتا ہوں قلم سے جا بہ جا شمشیر کا

دونوں عالم میں رہے گا ایک عالم میرے بعد
شور جائے گا نہیں یہ عالمِ تقریر کا

لاکھ اجڑے پر یہ دنیا بس رہے گی بار بار
بیج وہ بویا جہانِ شوق نے تعمیر کا

پھیل جائے گا زمیں سے آسماں تک اک غبار
خود ہی مٹ جائے گا یہ لکھا مری تقدیر کا

ہے اسیری میں بھی اپنے پاؤں سے لپٹی بہار
حلقہ حلقہ غنچہ و گل ہے مری تقدیر کا

میرؔ و غالبؔ کی کماں سے وہ جو چھوٹا تھا کبھی
اشکؔ بسمل ہے اسی فکر و نظر کے تیر کا

{۲}

آپ ہی گوہرِ نایاب ادا ہوجانا
عشرتِ قطرہ ہے دریا سے سوا ہوجانا

اپنی پہچان کو کھونا ہے فنا ہوجانا
آبِ گوہر ہے، تو دریا سے جدا ہوجانا

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا نامعلوم
موج کا اٹھنا ہے طوفانِ بلا ہوجانا

خاک وہ شئے ہے کہ انسان ڈھلا ہے جس سے
اب اگر خاک ہوئے خاکِ شفا ہوجانا

پاؤں کی گرد کو دیکھا ہے فلک چھوتے ہوئے
یہ بھی اک طرز ہے پندارِ انا ہوجانا

ابر کچھ آتے ہیں آ آ کے گذر جاتے ہیں
تشنہ لب دیکھے ہیں پانی کا ہوا ہوجانا

شہر در شہر ہو اخلاص و وفا کی خوشبو
گھر جو چھوڑا ہے تو اب موجِ صبا ہوجانا

مدّتوں یاد رکھیں جس کو زمانے والے
اشک وہ نغمۂ بلبل کی صدا ہوجانا

{۳}

کوئی آندھی چلی یا کوئی طوفاں نکلا
زیرِ افلاک میں اس درجہ پریشاں نکلا

برگِ آوارہ کی مانند پھراتی ہے صبا
آرزو سیر کی تھی ، کام یہ آساں نکلا

ہم تو بے یار و مددگار اٹھے ہر جا سے
کیا بھلا گرد کے ہمراہ بھی ساماں نکلا؟

اس کی آنکھوں میں ذرا جھانک کے دیکھا ہم نے
دشت ہی دشت بیاباں ہی بیاباں نکلا

کوئی بھی پیرہنِ کاغذی کافی نہ ہوا
حرف تو مہر کی مانند ہی عریاں نکلا

پیر ایسا ہو کوئی ہم بھی بنیں جس کے مرید
ملک بھر چھان لیا صاف یہ ویراں نکلا

یوں تو ہر ایک کو ہے دعویِ معراجِ سخن
معتبر سب سے مگر اشک مری جاں نکلا

{۴}

کیا عرضِ حال اپنا کسی کی جناب میں
اک زندگی ملی ہے سو وہ بھی عذاب میں

موجِ نفس ہے یا کوئی ہنگامۂ جہاں
عمرِ رواں ہے اپنی کسی انقلاب میں

ہر گام اپنا وسعت و عظمت سے ہے گزر
کتنا ہے لحہ کسی پیچ و تاب میں

تخلیقِ صد گہر ہی میں عظمت ہے بحر کی
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

رخشِ خیالِ یار پہ جب سے اڑان ہے
نے باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں

دم بھر کو تھی خوشی مجھے سیرِ بہشت کی
جاگا ہوا کہاں تھا کہ جاگا تھا خواب میں

ڈالی تھی اک نگاہِ غلط ہم نے بھی کبھی
چھالا سا پڑ گیا ہے رخِ ماہتاب میں

مردے میں جان پڑنے لگی ہے دمِ سماع
کس کی صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

آئے گا روزِ حشر تو سب ہوں گے روبرو
کب تک چھپا رہے گا کوئی یوں حجاب میں

اک لفظِ عشق ہی میں سمودی ہے کائنات
کیا اس سے زیادہ اور وہ لکھتے جواب میں

ہم کو تو چشمِ یار کی ہے بے خودی بہت
یہ نشہ و طلسم کہاں ہے شراب میں

کس ناز کس ادا سے وہ کرتے ہیں دل لگی
آتے نہیں ہیں سامنے آتے ہیں خواب میں

یہ اضطرابِ شوق تو ہے حسنِ زندگی
ناداں سمجھ رہے ہیں مجھے پیچ و تاب میں

اے عقل آگے بڑھ کے مرے دل کو تھام لے
خود کو نہ بھول جاؤں کہیں اضطراب میں

کس خوبیٔ طلسم سے وہ غیب غیب ہے
ہر اک سمجھ رہا ہے کوئی ہے نقاب میں

اک شعلہ دردِ دل سے ہوا تھا کبھی بلند
بھڑکی ہوئی ہے آگ وہی آفتاب میں

آنکھوں میں اپنی پیاس ہے کوئی غزال کی
دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں سراب میں

کب سے ہے میری نسل جہانِ خراب میں
آدم کے ذکر کو بھی جو رکھوں حساب میں

غالبؔ تری زمین پہ رنگِ فلک نما
ہے اشکؔ کا سخن بھی زمانے کے باب میں

{۵}

ہر نفس کوئی بے قراری ہے
عمر ہم نے تو یوں گذاری ہے

راز مرّیخ کا ہوا معلوم
آدمی کی تلاش جاری ہے

ارتقائے جہاں کے یہ منظر
سب ہماری ہی دستکاری ہے

کل جو بویا تھا خونِ دل ہم نے
ہر طرف اس کی لالہ زاری ہے

چل پڑے ہیں برنگِ موجِ صبا
زیست رفتار کی سواری ہے

گردشِ وقت ہے کہ ایک بھنور
رقص اپنا مدام جاری ہے

یاد گذرے ہوئے زمانے کی
دشت میں بادِ نو بہاری ہے

وہ جو گذرا بنامِ فکر و ہنر
لمحہ صدی پہ بھاری ہے

اشک اپنا غبارِ جاں جیسے
اک دھواں آسماں پہ طاری ہے

{۶}

آرزو کیا ہے التجا کیا ہے
ہم سے پوچھو کہ مدعا کیا ہے

عشق کے بعد جان جاؤ گے
ابتدا کیا ہے، انتہا کیا ہے

کوئی بتلائے ہم کو کیا معلوم
درد کیا چیز ہے دوا کیا ہے

جان کر بھی مٹے ہی جاتے ہیں
یہ محبت کا سلسلہ کیا ہے

جسم پر تیرتا ہوا جادو
اور اس کے سوا ادا کیا ہے

زخم مانگے ہے اور دل اپنا
چارہ گر ہم سے پوچھتا کیا ہے

ان سے مل کر عجیب عالم ہے
کچھ ہوا ہے مگر ہوا کیا ہے

چل رہے ہیں یہ جانتے ہی نہیں
منزلیں کیا ہیں راستا کیا ہے

آ کے شہرِ وفا میں جان گئے
خوشبوئیں کیا ہیں یہ ہوا کیا ہے

عظمتِ شعر ہم بھی رکھتے ہیں
کوئی سمجھے کہ مرتبا کیا ہے

{۷}

کبھی ہے شادی و غم اور کبھی نشیب و فراز
جہاں ہے بزمِ تماشا فلک ہے پردہ ساز

غریبِ شہر سہی دل امیر رکھتا ہوں
کبھی تو مجھ سے بھی کر کے تُو دیکھ راز و نیاز

نہیں ہے سہل مجھے خاک میں اِڑا دینا
مثالِ کوہ مرے بیٹھنے کا ہے انداز

حکایتِ شبِ ہجراں نہ دشمنوں کو سنا
نہیں ہے سینۂ اربابِ کینہ محرمِ راز

یہی خیال ہے تیری بلندیاں چھو لوں
بہت ہے عزمِ سفر دے مجھے ذرا پرواز

کھلی ہے آنکھ مری تیری دید پر جاناں
خدا کا شکر کہ بندوں کا وہ ہے بندہ نواز

اگر نہ خونِ جگر سے کرے وضو عاشق
تو دینِ عشق میں اس کی نہیں درست نماز

دھڑک رہا ہے کوئی اشک دل کی دھڑکن میں
خیالِ شعر و سخن کے لیے وہ ہے دمساز

{۸}

پایا خدا کی ذات سے بڑھ کر نہیں ہوں میں
تخلیق تو اسی کی ہوں کمتر نہیں ہوں میں

تکمیل ہو تو پاؤں میں گر جائے آسماں
سچ یہ ہے اپنے قد کے برابر نہیں ہوں میں

اے آئینہ صفات مجھے چھو کے دیکھ لے
ہنستا ہوا گلاب ہوں پتھر نہیں ہوں میں

نکلا ہوں بے خودی میں خدا جانے کس طرف
مدّت ہوئی کہ اپنے ہی در پر نہیں ہوں میں

پہچان اک الگ ہے مری اس جہان میں
اک قطرۂ گہر ہوں سمندر نہیں ہوں میں

حیرت سے دیکھتا ہے مجھے کس لیے جہاں
کیا حسنِ کائنات کا منظر نہیں ہوں میں

پڑھتا رہے گا مجھ کو زمانہ یہ بار بار
اک حرفِ خاص ہوں کوئی دفتر نہیں ہوں میں

ہیں میری ٹھوکروں میں امیروں کی محفلیں
کہوں کہ مرد قلندر نہیں ہوں میں

گونجے ہیں میرے شعر فرشتوں کی بزم میں
دنیا کے شاعروں سے تو کمتر نہیں ہوں میں

آنکھ بھر آئی تصور جاگا
اک سمندر کا سفر یاد آیا

بھول جانا تھا اسے آج کے دن
آج ہی زخمِ جگر یاد آیا

دیکھ کر مسجدیں ویران ہمیں
اپنا اجڑا ہوا گھر یاد آیا

مجلسِ بامِ ثریّا کے لیے
اپنی غزلوں کا ہنر یاد آیا

بات جو غالبؔ خستہ کی چلی
جانا پہچانا بشر یاد آیا

عظمتِ فن کے لیے اشکؔ ہمیں
علم کا بحرِ ہنر یاد آیا

{۱۰}

چہرے حسین دیکھوں کہ دیکھوں نظر کو میں
دل کہہ رہا ہے چوم لوں میرے ہنر کو میں

ہر سمت منزلوں کے اشارے ہیں کیا کروں
کوئی مجھے بتائے کہ جاؤں کدھر کو میں

ہر کوئی اجنبی کی طرح دیکھنے لگا
مدّت کے بعد آیا جو اپنے گھر کو میں

نادان تھا جو عشق کے دھوکے میں آ گیا
لیتا نہ سر پہ ورنہ کسی دردِ سر کو میں

کھائی ہیں بار بار جہاں دل نے ٹھوکریں
پہچانتا ہوں خوب تری رہگذر کو میں

تھا سلسلہ عجیب ہی اونچی اڑان کا
وہ عزم تھا کہ بھول گیا بال و پر کو میں

آئی نہ اپنی یاد محبت کی راہ میں
کرتا رہا تلاش اسی بے خبر کو میں

دل نے جہاں کہا وہیں سجدے میں گر پڑا
پہچانتا نہیں ہوں ابھی سنگِ در کو میں

سلجھا دیئے ہیں وقت کے گیسو کبھی کبھی
کرتا ہوں استعمال یوں اپنے ہنر کو میں

میرے لیے تو اشک ہے اک بحرِ بے کراں
پہچانتا نہیں کسی لعل و گہر کو میں

{۱۱}

آتشِ دل نہ بجھی ان پہ اثر ہونے تک
ہم بصد آہ رہے عمر بسر ہونے تک

غیرتِ عشق نے محفل سے اٹھایا ہم کو
ہم نہیں بیٹھے عنایت کی نظر ہونے تک

کون گردشِ دوراں کے بھنور سے نکلا
کتنے طوفان اٹھے شام و سحر ہونے تک

جانے کیا بیت گئی دل پہ خدا ہی جانے
ہم تھے بے خود تری راہوں سے گذر ہونے تک

گرد اڑتی ہی رہی زیست کے ویرانوں میں
اور ہم چلتے رہے ختمِ سفر ہونے تک

صبر ہاتھوں سے چھٹی ، ٹوٹ گئی آس ،امید
خاک راہوں میں اڑی منزلیں سر ہونے تک

کس قدر دل کو جلایا ہے نہ پوچھے کوئی
گرمیٔ عشق رہی خونِ جگر ہونے تک

یوں تو کہنے کو ذرا سا یہ سفر ہے لیکن
عمر کٹ جاتی ہے دیوار سے در ہونے تک

آس بندھتی تھی کبھی خواب بکھر جاتے تھے
زندگی کرتے رہے شہر میں گھر ہونے تک

لفظ میرے مہہ و انجم کی طرح ہیں روشن
اشک تھے گم کہیں نازل یہ ہنر ہونے تک

ابراہیم اشکؔ کی دیگر تخلیقات

۱۔الہام..................شعری مجموعہ

۲۔آگہی..................شعری مجموعہ

۳۔کربلا..................سلام اور مرثیے

۴۔اندازِ بیاں اور..................تنقید، شرحِ غالب

زیرِ طبع

۵۔اقبال شناسی..................تنقیدی مضامین

۶۔معنویت..................تنقیدی مضامین

۷۔ماحول..................ہندی شعری مجموعہ

۸۔آفاق..................شعری مجموعہ

۹۔کبیرا کھڑا بازار میں..................طنزیہ

اہتمام :- ندیم پبلیکیشنز

''الہام''، ''آ گہی''، ''کربلا'' (مرثیہ) ان کتابوں کے علاوہ تفہیم غالب، علامہ اقبال، مولانا آزاد، معنویت کے تعلق سے کئی تنقیدی مضامین، لعلین و چہارن اصناف سخن کی ایجاد، غزل، نظم، مرثیہ، سلام، رباعی، دوہا، مثنوی، قصیدہ، گیت، ماہیا غزل، اغرض کہ اپنی اسی رنگارنگی کے باعث ابرہیم اشک اردو ادب۔ میں ایک معروف نام ہے۔ بحثیت شاعر بھی اور بحثیت نثر نگار بھی۔

غالب ہماری زبان کا وہ شاعر ہے جو ہر زمانے میں موضوع بحث رہا ہے۔ اپنی شاعری اور اپنی شاعری کی شرح دونوں حوالوں سے۔ نظم طباطبائی سے لے کر شمس الرحمٰن فاروقی تک نہ جانے کتنی عالی مقام شخصیتوں نے کلام غالب کو سمجھتے اور سمجھاتے ہوئے شرحیں لکھی ہیں۔ شرح نگاری ایک ایسا کام ہے جسے ہم کبھی بھی قطعیت کے زمرے میں نہیں رکھ سکتے۔ اس میں اختلاف و انحراف کی گنجائش ہمیشہ موجود ہوتی ہے۔ لہذا ''انداز بیاں اور....'' اس کتاب میں ابراہیم اشک نے بھی غالب کے کلام اور شارحین کے کام کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد بعض اختلافی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو یا مجھے ابراہیم اشک کی بعض باتوں سے اختلاف ہو مگر ان کی محنت اور اپنے کام کی تئیں ایمانداری کا اعتراف تو ہم سب کو کرنا ہی پڑے گا۔

قمر صدیقی